ستمبر 2006

ماہ نامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

قیمت: -/15 روپے

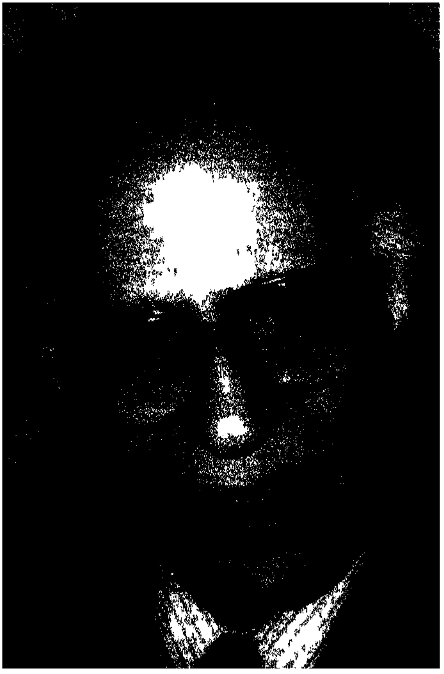

احمد ندیم قاسمی

ولادت: 20 نومبر 1916 وفات: 10 جولائی 2006

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

27 جولائی 2006 کو جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف لینگویجز کمیٹی روم میں قومی اردو کونسل کی کچھ اہم مطبوعات کی رسم اجرا کے موقعے پر لی گئی تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی (وائس چیئرمین قومی اردو کونسل)، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور پروفیسر قمر رئیس۔

اسی موقعے پر لی گئی ایک اور تصویر میں (دائیں سے) پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، جناب م۔ن۔ سعید اور پروفیسر زماں آزردہ۔

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد 8، شمارہ 9 ستمبر 2006

مدیر: ڈاکٹر آر. کے. بھٹ

معاون مدیر: ڈاکٹر فیروز عالم

ناشر اور طابع:
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز، بہلول احمد
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا، فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی- 066 110
فون: 26103938، 26103381
26179657 فیکس: 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26169416، 26109746

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 5-1، ناگی گلی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات 2
ہماری بات 5

گوشۂ احمد ندیم قاسمی

● بابا .... گلزار 6
● سر شاخ گل .... پروین شاکر 7
● قاسمی صاحب .... شمس الرحمٰن فاروقی 8
● احمد ندیم قاسمی (سایہ دار اور فلک بوس شجر) .... ایم قمرالدین 11
● ایک آدمی احمد شاہ نامی .... محمد خالد اختر 12
● آخری آدمی .... جمیل الدین عالی 21
● احمد ندیم قاسمی .... رفعت سروش 23
● احمد ندیم قاسمی — ایک خراج عقیدت .... مجتبیٰ حسین 26
● احمد ندیم قاسمی — ایک ہشت پہلو شخصیت .... نند کشور وکرم 29
● احمد ندیم قاسمی — بے باک صحافی اور عصری حسیت سے ہم آہنگ ادیب .... شاہد اسلم 32
● رئیس خانہ — قاسمی کا ایک نمائندہ افسانہ .... راشد انور راشد 34
● سوانحی اشارے .... نند کشور وکرم 37
● نظمیں .... احمد ندیم قاسمی 39
● غزلیں .... احمد ندیم قاسمی 44
● قطعات .... احمد ندیم قاسمی 47
● بین (افسانہ) .... احمد ندیم قاسمی 48
● کچھ لوک فن کے بارے میں (مضمون) .... احمد ندیم قاسمی 52

روبرو

● بجے گوڈبولے سے گفتگو .... فیروز عالم 54

زبان اور تعلیم

● امریکہ میں اردو کی مقبولیت .... محمد جہانگیر وارثی 57

شخصیات

● ایس آر رنگاناتھن .... دانش غنی 59
● غریب انسان کامیاب سائنس داں .... عبدالودود انصاری 61

اردو خبرنامہ .... ادارہ 65
تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 73

بچوں کا گوشہ

● ایکشن ("بے زبانوں کی دنیا" سے ماخوذ) .... حیدر بیابانی 79

آپ کی بات

■ **ڈاکٹر اشفاق محمد خاں، اے۔931/4، امیر نگر، لکھنؤ۔16 (یو. پی.)۔**

ماہ نامہ "اردو دنیا" قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا معروف و مقبول جریدہ ہے۔ گذشتہ تین سال سے "اردو دنیا" کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ درمیان میں کچھ عرصے کے لیے کسی وجہ سے رسالہ مجھے نہ مل سکا لیکن اب از سرِ نو ماہ جولائی سے رسالہ مجھے ملنا شروع ہو گیا ہے۔

بظاہر یہ رسالہ 80 صفحات پر محیط ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ان مختصر صفحات میں بہت کچھ مل جاتا ہے جو ضخیم رسائل میں بھی نہیں مل پاتا۔ بالخصوص اردو زبان و ادب سے متعلق جتنی امکانی معلومات ہمیں "اردو دنیا" سے ہوتی ہیں وہ ایک صاحبِ ذوق قاری کے لیے تشفی بخش ہوتی ہیں۔ بیشتر موضوعات قارئین کی دلچسپی سے تعلق رکھتے ہیں یعنی ادبی، سماجی مضامین کے علاوہ سائنس اور صحت، ماحولیات، تاریخ، صحافت، شخصیات، قانون، نئی مطبوعات، اردو خبریں، تبصرے اور تعارف کے علاوہ بچوں کا گوشہ رسالے کی قدر و قیمت میں اضافے کا باعث ہیں۔ اس طرح ہم بلا مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ "اردو دنیا" اردو کا نہایت جامع اور ہر دلعزیز رسالہ ہے جس کو اردو زبان و ادب سے دلچسپی اور محبت رکھنے والے تمام احباب کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

ماہ جولائی 2006 کے شمارے میں فیروز عالم کی "علی رفاد فتیحی سے گفتگو" رسالے کی جان ہے۔ اس گفتگو کو جو بالخصوص لسانی مطالعے سے متعلق ہے اپنے دلچسپ اسلوب میں بیان کرنا ایک منفرد اور خاصے کی چیز کہا جا سکتا ہے۔ اردو کے دانشور احباب یقیناً اس موضوع سے لطف اندوز ہوں گے۔ فتیحی صاحب کے بیشتر جوابات قابلِ اطمینان ہیں۔

■ **رضوان خاں، 96 شیخ سرائے، سیتاپور۔ 261001، (یو. پی.)۔**

اگست 2006 کا "اردو دنیا" اس وقت میرے مطالعے میں ہے۔ اداریہ میں آپ نے ملک کے مختلف حصوں سے شائع ہونے والے رسائل سے متعلق جو گفتگو کی ہے، اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ "اردو دنیا" اپنی ہی نہیں دیگر رسائل کی بھی خبر رکھتا ہے۔ آپ کا یہ کہنا بجا ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں اردو اخبارات و رسائل کی اشاعت اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو والے اردو اخبارات و رسائل پر پیسہ خرچ کرتے ہیں ورنہ لگاتار خسارے میں چل کر کوئی رسالہ ایک دو برس تو زندہ رہ سکتا ہے، 50 یا 75 برس تک نہیں۔ ہاں اس بات سے ہم بھی لوگ اتفاق کریں گے کہ اردو اخبارات، رسائل اور کتب پر مزید پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہاں پر اس حقیقت کا اظہار بھی کرتا چلوں کہ مالی اعتبار سے قدرے کم مضبوط لوگ، مال دار اردو والوں کی بہ نسبت زیادہ پیسہ خرچ کرتے ہیں۔ بڑے ادبا و شعرا میں سے بعض کا نظریہ مفت کتب و رسائل حاصل کرنے کا ہے جب کہ اگر وہ یہ سوچنے کی زحمت کریں کہ جس اردو سے وہ ہزاروں اور لاکھوں روپے کما رہے ہیں کیا اس زبان پر چند روپے خرچ کرنا ان کا اخلاقی فریضہ نہیں ہے تو شاید صورتِ حال بہتر ہو جائے۔ اداریہ میں بعض ایسے رسائل کے نام آنے سے رہ گئے جو چھوٹے شہروں سے تواتر کے ساتھ شائع ہو کر خدمت زبان و ادب انجام دے رہے ہیں۔ خیر ہر ایک کا ذکر ایک صفحہ میں ممکن بھی نہیں۔

■ **ڈاکٹر نیاز سلطان پوری، سیح پبلیکیشنز و پبلی جمدولی، کتاواں، ضلع سلطانپور (یو. پی.)۔**

ماہ نامہ "اردو دنیا" شمارہ اگست 2006 باصرہ نواز ہوا۔ خط کی اشاعت کے لیے بہت بہت شکریہ۔ ممتاز فکشن نگار "عابد سہیل سے گفتگو"، "کشمیر — محبتوں کی سرزمین" اور دیگر سبھی مضامین افادیت کے حامل ہیں۔ "عابد سہیل سے گفتگو" خاص طور پر معلوماتی اور پر مغز ہے۔ "فن ترجمہ نگاری: حدود و امکانات" اگرچہ مختصر مضمون ہے لیکن مضمون نگار نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی بات معزز قارئین کے سامنے رکھ دی ہے۔ احمد ندیم قاسمی مرحوم کا افسانہ "پرمیشر سنگھ" بھی عمدہ افسانہ ہے۔ بیس پچیس سال کا عرصہ ہوا موصوف کا دہلی کے کسی ادبی جریدے میں ایک افسانہ "گنڈاسا" شائع ہوا تھا۔ اس کے نقوش ہنوز دل و دماغ پر مرتسم ہیں۔ شاید یہی ایک اچھے اور کامیاب فنکار کی خصوصیت ہے۔ پریم چند کی ادبی روایت کو آگے بڑھانے میں قاسمی نے جو اہم کردار ادا کیا ہے اس سے اردو ادب کا ہر سنجیدہ قاری اور ناقد واقف ہے۔ 1857 کی بغاوت میں وہابیوں کا

"حصہ" میں ص 53 پر چائل کے بجائے چیل مرقوم ہے چائل (CHAIL) الہ آباد کی ایک تحصیل ہے بزبان انگریزی CHAIL سے مصنف/مولف/مترجم کو سہو ہوا ہوگا۔ جس کی تصحیح ضروری ہے۔ ایک بار پھر آپ کو اور آپ کے رفقائے کار کو مبارک باد دینا چاہوں گا جن کی بدولت اتنا معیاری مجلّہ ماہ بہ ماہ منصۂ شہود پر آتا رہتا ہے۔

■ **محمد عطاء اللہ، اوسس پبلک اسکول، بمقابل تھانہ چوکی، ڈھاکہ، مشرقی چمپارن (بہار)۔**

اگست 2006 کا شمارہ موصول ہوا۔ متعلقہ شمارے کے سرورق پر رسائل کا عکس اداریے کا اشاریہ ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ اردو کے تمام اہم اور غیر اہم رسائل کا عکس ایک صفحہ میں سمٹ آئے۔ متعلقہ شمارے میں زبیر رضوی کا مضمون "فسادات اور اردو کا افسانوی ادب"، "عابد سہیل سے گفتگو" عمدہ اور معلومات افزا ہیں۔ نجم الغنی کا "بحر الفصاحت" سے ماخوذ مضمون "شعر کی تعریف" بہت پسند آیا۔ نجم الغنی کی یہ کتاب اردو شعر و ادب میں معتبر حوالے کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ تبصرہ و تعارف میں "ادب ساز" پر مخمور سعیدی کا تبصرہ، "سلک معنی" پر حقانی القاسمی کا تبصرہ اور "ادبی محاکے" پر ظہیر رحمتی کا تبصرہ معروضی اور معیاری ہے۔

■ **بہلول احمد مہدیوا، جوکی ہاٹ، ضلع ارریہ، بہار۔ 854329**

"اردو دنیا" کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ جریدے میں شامل تمام مضامین کے مطالعے سے سائنس ٹکنالوجی، سماجیات، ماحولیات، تاریخ اور صحافت وغیرہ سے متعلق کافی معلومات بہم پہنچتی ہے۔ "تبصرہ و تعارف" اور "بچوں کے گوشے" رسالے کی دلچسپی کا باعث ہیں۔ دنیائے اردو میں "اردو دنیا" واحد رسالہ ہے جس میں کہ طلبہ و طالبات، اساتذہ اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والوں کے معیار کے مطابق مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس جیسا کوئی اور رسالہ اردو میں نہیں ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح پر بھی یہ جریدہ بے حد مقبول ہوتا جا رہا ہے۔ رسالے کی تزئین کاری اور ترتیب و تدوین کے لیے شعبۂ ادارت قابل مبارک باد ہے۔ ہم غیر جانب دار ہو کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ "اردو دنیا" دیگر اردو ماہناموں میں نہایت جامع اور ہر دلعزیز جریدہ ہے۔

■ **بکیل انصاری ہمنوا روز، بلرام پور (یو.پی.) 271201**

"اردو دنیا" ہمیشہ سے اپنی دستاویزی اور معلوماتی کردار کے ساتھ باصرہ نواز ہوتا ہے جس سے مجھ جیسے لوگوں کو استفادہ کرنے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ یہ آپ لوگوں کی بیکل نوازی ہے کہ برابر "اردو دنیا" سے روشناس کراتے رہتے ہیں۔ آپ لوگ ملک اور صوبوں میں اردو کے سلسلے میں جو کام کر رہے ہیں وہ لائق صد تحسین ہے۔ اردو تعلیم کے ضمن میں خواہ وہ اسکولی ہو یا مراسلاتی، آپ کی کاوشیں قابل تعریف ہیں۔

■ **ساغر برنی، 45۔اے، آر۔ڈی نمبر 16، آزاد نگر، جمشید پور، جھارکھنڈ۔**

ماہ اگست 2006 کا "اردو دنیا" پیش نظر ہے۔ یہ ایک منفرد علمی اور ادبی رسالہ ہے جو ہر اردو پڑھنے والے کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہے۔ اس شمارے میں "فن ترجمہ نگاری— حدود اور امکانات" اور "اردو معلموں کی تربیت کا مسئلہ" اچھے مضامین ہیں۔

"فسادات اور اردو کا افسانوی ادب" زبیر رضوی صاحب کا مضمون پڑھا۔ سارا مضمون ہنر مندانہ پیوندکاری اور رفوگری کی بہترین مثال ہے۔ زبیر رضوی ایک اچھے شاعر اور صحافی کے ساتھ ساتھ ایک باشعور سماجی کارکن بھی ہیں۔ اظہار اثر کا مضمون ہمارے نقادوں کو دعوت فکر دیتا ہے۔

■ **پروفیسر افتخار عالم خاں، عالم منزل، مزہرہ باغ، علی گڑھ۔ 202001 (یو.پی.)۔**

"اردو دنیا" کے تازہ شمارے میں اقبال محی الدین کا مضمون بعنوان "آب و ہوا کے نمونے میں تبدیلی اور اثرات" پڑھا۔ مجھے اندازہ ہے کہ اس طرح کے عام فہم مضامین لکھنے میں کس قدر دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خاص طور پر سائنسی اصطلاحات کا ترجمہ ایک بڑا مسئلہ ہے۔ لیکن انھوں نے ان دشواریوں کے باوجود جس چابکدستی سے ہر بات کو عام فہم زبان میں بیان کر دیا ہے اور جس سادگی سے ڈھیر ساری نہایت عمدہ معلومات جمع کر دی ہے، وہ قابل تعریف ہے۔

■ **زبیر احمد بھاگلپوری، شعبۂ اردو، بہار قانون ساز کونسل، پٹنہ۔ 15**

"اردو دنیا" کا ماہ اگست 2006 کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ "ہماری بات" کے تحت آپ کا مثبت نقطۂ نظر یقیناً اردو رسائل کے مدیران کے لیے حوصلہ افزا ثابت ہوگا۔ "روبرو" کے تحت عابد سہیل سے ممتاز عالم کی گفتگو طوالت کے باوجود سیر حاصل ہے۔ کالم "زبان و تعلیم" کے تحت پروفیسر سید احسان الرحمٰن کا مقالہ "فن ترجمہ نگاری: حدود اور امکانات" پسند آیا۔ ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ ہر زبان میں کچھ نہ کچھ سقم ہوتا ہے اور کچھ امتیازی خوبیاں ہوتی ہیں۔ کے.پی. شمس الدین کا مقالہ "کیرالا میں اردو" بھی بہت خوب ہے۔ انھوں نے ریاست

کیرالا میں اردو کی صورت حال کا ضلع وار جائزہ پیش کر کے تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔

■ **ڈاکٹر احمد امتیاز، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔ 110007**

''اردو دنیا'' اگست کا شمارہ پیش نظر ہے۔ سارے مشمولات پسند آئے۔ آپ کی ادارت میں ''اردو دنیا'' خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہے۔ اس شمارے میں میری کتاب ''ادبی محاکے'' پر ڈاکٹر ظہیر رحمتی کا تبصرہ شائع ہوا ہے۔ غلطی سے ناشر کے طور پر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی شائع ہو گیا ہے جب کہ اس کتاب کے ناشر ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج، نئی دہلی ہیں۔

■ **انوار انصاری، اولڈ ہزاری باغ روڈ، چوٹا بھٹہ، شانتی نگر، رانچی۔ 834001**

جون 2006 کے شمارے میں ہماری بات کے تحت آپ نے دلوں کو چھو لینے والے نغموں کے خالق نوشاد علی کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ شمارہ بھی اہم اور قابل قدر ہے۔ انجم مانپوری کا انشائیہ ''کرائے کی ممتا'' پڑھ کر انجم صاحب کی یاد تازہ ہو گئی۔ حکیم اشہر قدیر کا مضمون ''قبض — اسباب اور علاج'' معلوماتی ہے۔

خبر نامہ کے ذریعے یہ جان کر یک گونہ تسلی ہوئی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا اقلیتی کردار سپریم کورٹ کی ہدایت کے مطابق جو پوزیشن پہلے تھی وہ تا حکم ثانی برقرار رہے گی۔ ناول ''لفٹ'' پر ڈاکٹر فیروز عالم کا تبصرہ گو مختصر ہے مگر عمدہ ہے۔ ہمیشہ کی طرح ''بچوں کا گوشہ'' اچھا ہے۔ ''ترکی ٹوپی'' بچوں کے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔

■ **اختر سندیلوی، 34 فقیرا گنج، کٹرہ، الہ آباد۔ 211002 (یو۔ پی۔)**

''اردو دنیا'' کا شمارہ، مئی 2006 وقت پر مل گیا اور اسے پورا پڑھا۔ اپنی تمام انفرادی خوبیوں کے ساتھ سائنس اور ماحولیات کے تحت ختم ہوتے آبی ذخائر ایک انتباہ ہے ان لوگوں کے لیے جو پانی کو بے ضرورت بڑا پمپ لگا کر پورے محلہ کا پانی کھینچ لیتے ہیں اور نہ صرف گرمی بلکہ ہر موسم میں پورا گھر اور فرش دھوتے ہیں اور بیسیوں بالٹی پانی صدر دروازہ کی گلی یا سڑک پر چھڑکتے ہیں اور اہل محلّہ بوند بوند پانی کو ترستے ہیں۔ ان کے گھر میں پائپ ہے مگر پانی نہیں پہنچتا اس لیے کہ بڑے پمپ سے پانی کھنچا چلا جاتا ہے۔ ایسے پمپوں کو سرکار غیر قانونی قرار دے تو بہتر ہے۔ ''سنڈے ہو یا منڈے روز کھائیں انڈے'' بھی معلوماتی مضمون ہے۔ مدن گوپال صاحب کا پنڈت جواہر لال نہرو کا سفر یورپ بھی معلوماتی ہے۔

جناب جاوید ندیم کا مضمون نشتر خانقاہی مرحوم پر بہت خوب ہے۔ بچوں کے گوشے میں ''چھوٹی امی'' ایک سبق آموز افسانہ ہے۔ ترتیب و تدوین کے لیے میری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔

■ **رحیم رضا، کھرنی پورہ، پاول، ضلع جلگاؤں، مہاراشٹر۔ 425301**

''اردو دنیا'' باقاعدگی سے ملتا ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی مختلف اسکیموں کے تحت اردو زبان و ادب کے لیے جو گراں قدر کام کیے جا رہے ہیں وہ یقیناً قابل تعریف ہیں خصوصاً اردو کتب کی اشاعت۔ ''اردو دنیا'' جیسا رسالہ جس میں اردو بستیوں کی سرگرمیاں، اردو اکادمیوں کی کارگزاریاں، بہترین مضامین، بچوں کا گوشہ اور نئی کتابوں پر تبصرے گویا آپ نے کوزے میں سمندر بھر دیا ہے۔ فروری 2006 کے شمارے میں ''اردو زبان کی اہمیت و ضرورت'' ''اردو زبان کی تعلیم'' کہانی ''قاصد'' کے علاوہ ''اردو خبر نامہ'' مجھے اچھے لگے۔

ہر ماہ اس قدر معلوماتی اور مفید مضامین جمع کرنا آپ ہی کا خاصہ ہے۔ قومی اردو کونسل کی اردو زبان و ادب کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

□□□

بچوں کی صلاحیتیں ان کی مادری زبان سے ابھرتی ہیں۔

گھروں میں بہتر اردو تعلیم کا انتظام کیجیے۔

اردو کی نئی نسل کو تیار کرنا ہم سب کا فرضِ اولین ہے۔

ہماری بات

بیسویں صدی کے اردو ادب کی کوئی تاریخ ایسی نہیں لکھی جا سکتی جس کا ایک پورا باب احمد ندیم قاسمی کے فکر وفن کے گوناگوں پہلوؤں کے بیان کے لیے وقف نہ ہو۔ ان کی پہلی محبت شاعری تھی، پھر وہ افسانہ نگاری کی طرف مائل ہوئے اور ان دونوں اصناف میں انھوں نے اپنی انفرادی شناخت قائم کی۔ صحافت ان کا تیسرا وسیلۂ اظہار تھی جو ان کا ذریعۂ معاش بھی بنی۔ ان کے خاندانی پس منظر کی تشکیل خانقاہی روایات کے زیر اثر ہوئی تھی جس نے ان میں ایک خوئے استغنا پیدا کر دی تھی جو آخر تک ان کے ساتھ رہی۔ قاسمی صاحب نے طویل عمر پائی اور لگ بھگ نوے سال کی عمر میں انھوں نے پچاس سے کچھ اوپر کتابیں تصنیف کیں۔

قاسمی صاحب کی ابتدائی زندگی کافی مشکلات بھری تھی۔ جب وہ اپنے آبائی گاؤں کو خیر باد کہہ کر لاہور پہنچے تو ان کی گزر بسر کا کوئی سہارا نہ تھا۔ کئی بار فاقہ کشی کی بھی نوبت آئی لیکن ان کی غیرت نے کسی کو اپنے احوال سے باخبر کرنے سے انھیں باز رکھا۔ انھی دنوں ان کی ملاقات اختر شیرانی سے ہوئی۔ وہ انھیں بے حد عزیز رکھنے لگے اور ان کی کافی حوصلہ افزائی بھی کی۔ قاسمی صاحب اختر شیرانی کی شاعری کے گرویدہ تو پہلے ہی سے تھے ان کے مشفقانہ رویے نے قاسمی صاحب کو ان سے شخصی طور پر بھی بہت قریب کر دیا۔ اختر شیرانی رند بلانوش تھے لیکن ان کے ساتھ خاصا وقت گزارنے کے باوجود قاسمی صاحب نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا اور نہ ان کی طبیعت میں لاابالی پن آیا۔ اس سے ان کے مزاج کی استقامت اور اپنے آپ پر قابو رکھنے کی ان کی غیر معمولی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اختر شیرانی کی شاعری اور شخصیت سے قاسمی صاحب کا لگاؤ آخر تک رہا۔

انھی دنوں احمد ندیم قاسمی کی ملاقات امتیاز علی تاج سے ہوئی جنھوں نے انھیں اپنے ماہانہ رسالے ''پھول'' کی ادارت کی پیش کش کی جو انھوں نے قبول کر لی۔ ''پھول'' بچوں کا رسالہ تھا۔ اس کی ایک سالہ ادارت کے زمانے میں قاسمی صاحب نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھیں جو بچوں میں بہت پسند کی گئیں پھر ان کا تقرر بطور اکسائز سب انسپکٹر ہو گیا لیکن اس ملازمت کی مصروفیتیں ان کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی تھیں لہٰذا انھوں نے جلد ہی اسے خیر باد کہہ دیا اور ہمیشہ کے لیے ادب وصحافت سے وابستگی اختیار کر لی۔ قاسمی صاحب کی صحافتی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز خواتین کے رسالے ''تہذیب نسواں'' سے ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے ''ادب لطیف''، ''سویرا'' اور ''نقوش'' جیسے مقتدر ادبی رسائل کی ادارتی ذمہ داریاں بڑی کامیابی کے ساتھ نبھائیں۔ جب انھوں نے اپنا ذاتی رسالہ ''فنون'' جاری کیا تو یہ تجربات ان کے بڑے کام آئے اور اس رسالے نے بہت جلد اردو کی ادبی صحافت میں اپنے لیے ایک امتیازی مقام حاصل کر لیا۔

1936 میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے بعد قاسمی صاحب نے اس انجمن سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ وہ انجمن کے سکریٹری بھی رہے لیکن آگے چل کر جب انجمن نظریاتی تشدد پسندی کا شکار ہوئی تو قاسمی صاحب نے اس کی سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ وہ ادب کو سیاست سے بے نیاز رکھنے کے قائل نہیں تھے لیکن ایک سچے ادیب کی طرح ادب پر سیاست کی بالادستی انھیں قبول نہ تھی۔ ''فنون'' جس کا اجرا انھوں نے 1963 میں کیا، ادب کے سنجیدہ قارئین میں اس کی روز افزوں مقبولیت کا سبب یہی تھا کہ اس میں انھوں نے تمام اچھے لکھنے والوں کی تخلیقات کو جگہ دی۔ خواہ وہ کسی مکتبۂ فکر کے ہوں اور خواہ ان کا تعلق پرانی نسل سے ہو یا نئی نسل سے۔ انھوں نے رسالے کے ذریعے بہت سے نئے لوگوں کو متعارف کرایا جو آج مستند شاعر یا ادیب سمجھے جاتے ہیں۔

قاسمی صاحب کے ہم عصروں کی صف میں اگر ایک طرف سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور غلام عباس جیسے افسانہ نگار تھے تو دوسری طرف شاعروں میں میراجی، ن م راشد، فیض احمد فیض اور علی سردار جعفری جیسے شاعر۔ قاسمی صاحب نے ان دیو قامت قلم کاروں کے درمیان بطور افسانہ نگار بھی اور بحیثیت شاعر بھی اپنی پہچان قائم کی، یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔

قاسمی صاحب اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن وہ اپنے فکر وفن کا اثاثہ ایک قیمتی ورثے کی شکل میں ہمارے لیے چھوڑ گئے ہیں جس کی حفاظت ہمارا ادبی فریضہ ہے۔

□□□

گوشۂ احمد ندیم قاسمی

برصغیر کے ممتاز افسانہ نگار، شاعر اور صحافی احمد ندیم قاسمی کی یاد میں ہم نے یہ گوشہ ترتیب دیا ہے۔ ہم جناب شمس الرحمٰن فاروقی، جناب رفعت سروش اور جناب نند کشور وکرم کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر بہت کم وقت میں قاسمی صاحب پر اپنے مضامین ہمیں ارسال فرمائے۔ جناب گلزار اور جناب ایم۔ قمرالدین نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ گوشے کو مزید جامع بنانے کے لیے ہم نے قاسمی صاحب کی کچھ تخلیقات بھی شامل کی ہیں اور ان کی شخصیت اور فن پر کچھ پرانی تحریریں بھی شریک اشاعت کی ہیں۔ اس گوشے کا آغاز ہم گلزار صاحب کی نظم سے کر رہے ہیں جو مرحوم قاسمی صاحب کو 'بابا' کہا کرتے تھے۔

بابا............

حواس کا جہان ساتھ لے گیا
وہ سارے بادبان ساتھ لے گیا
بتائیں کیا، وہ آفتاب تھا کوئی
گیا تو آسمان ساتھ لے گیا
کتاب بند کی اور اُٹھ کے چل دیا
تمام داستان ساتھ لے گیا
میں سجدے سے اٹھا تو کوئی بھی نہ تھا
وہ پاؤں کے نشان ساتھ لے گیا

گلزار
"BOSKYANA"
Pali Hill, Bandra (W)
Mumbai-400 050.

□□□

پروین شاکر

سرِ شاخِ گل

(نذرِ احمد ندیم قاسمی)

وہ سایہ دار شجر
جو مجھ سے دور، بہت دور ہے، مگر اس کی
لطیف چھاؤں
سجل، نرم چاندنی کی طرح
مرے وجود، مری شخصیت پہ چھائی ہے!
وہ ماں کی بانہوں کی مانند مہرباں شاخیں
جو ہر عذاب میں مجھ کو سمیٹ لیتی ہیں
وہ ایک مشفق دیرینہ کی دعا کی طرح
شریر جھونکوں سے پتوں کی نرم سرگوشی
کلام کرنے کا لہجہ مجھے سکھاتی ہے
وہ دوستوں کی حسیں مسکراہٹوں کی طرح
شفق عذار، دھنک پیرہن شگوفے، جو
مجھے زمیں سے محبت کا درس دیتے ہیں!

اداسیوں کی کسی جانگداز ساعت میں
میں اس کی شاخ پہ سر رکھ کے جب بھی روئی ہوں
تو میری پلکوں نے محسوس کر لیا فوراً
بہت ہی نرم سی اک پنکھڑی کا شیریں لمس!
(نمی تھی آنکھ میں لیکن میں مسکرائی ہوں!)
کڑی ہے دھوپ
تو پھر برگ برگ ہے شبنم
تپاں ہوں لیے
تو پھر پھول پھول ہے ریشم
ہرے ہوں زخم
تو سب کونپلوں کا رس مرہم!

وہ ایک خوشبو
جو میرے وجود کے اندر
صداقتوں کی طرح زینہ زینہ اتری ہے
کرن کرن مری سوچوں میں جگمگاتی ہے
(مجھے قبول، کہ وجداں نہیں یہ چاند مرا
یہ روشنی مجھے ادراک دے رہی ہے مگر!)

وہ ایک جھونکا
جو اس شہرِ گل سے آیا تھا
اب اس کے ساتھ بہت دور جا چکی ہوں میں
میں ایک ننھی سی بچی ہوں اور خوشی سے
بس اس کی انگلیاں تھامے، اور آنکھیں بند کیے
جہاں جہاں لیے جاتا ہے، جا رہی ہوں میں!

وہ سایہ دار شجر
جو دن میں میرے لیے ماں کا نرم آنچل ہے
وہ رات میں، مرے آنگن پہ ٹھیرنے والا
شفیق، نرم زباں، مہربان بادل ہے

مرے دریچوں میں جب چاندنی نہیں آتی
جو بے چراغ کوئی شب اُترنے لگتی ہے
تو میری آنکھیں کرن کے شجر کو سوچتی ہیں
دبیز پردے، نگاہوں سے ہٹنے لگتے ہیں
ہزار چاند، سرِ شاخِ گل اُبھرتے ہیں!

□□□

شمس الرحمن فاروقی

قاسمی صاحب

کئی سال کی بات ہے، 1948 کا سال رہا ہوگا، یا شاید 1949 ہو۔ بہرحال پچاس سے بہت اوپر برس گذر گئے ہیں۔ میں نے ایک رسالے میں احمد ندیم قاسمی کی ایک نظم پڑھی۔ ان دنوں ترقی پسند ادب کے چرچے ہر طرف تھے، اس لیے میں بھی ان کے نام سے آشنا تھا۔ لیکن ان کی شاعری کے توسط سے نہیں، بلکہ ان کے افسانوں کے توسط سے۔ نظم کا آخری بند میرے دل پر کچھ ایسا نقش ہوا کہ آج تک دھندلا یا نہیں ہے۔

زندگی کو سنوارنے کی مہم
کب مقدر کے اختیار میں ہے
یہ زمیں یہ خلا کی رقاصہ
آدم نو کے انتظار میں ہے

زمین کے لیے خلا کی رقاصہ کا لقب، یا استعارہ، مجھے بہت اچھا لگا۔ زمین کا حسن، اس کی وسعت، سیارے یا ستارے کی حیثیت سے محفل آفاق میں اس کا وجود، مسلسل رقص میں محو لیکن خلائے بسیط میں بالکل تنہا، گویا وہ سچے فنکاروں کی طرح سامع یا تماشائی سے بے نیاز ہو، حتیٰ کہ وقت سے بھی بے نیاز ہو، کہ خلا میں لامکانی ہے اور جہاں لامکانی ہے وہاں وقت بھی نہیں۔ یہ سب باتیں کچھ مبہم، کچھ بہت روشن میرے ذہن میں گونجتی رہیں۔ آج بھی جب وہ شعر یاد آجاتے ہیں تو اسی طرح کی محویت اور مصروفیت، اسی طرح کی لگن اور زمان و مکان کے اسی تسلسل کی تصویر ذہن میں ابھرتی ہے۔ جس نے اس دن میرے نوآموز تخیل کو زندگی کی سی حرارت اور سرور عطا کیا تھا۔ پھر یہ خود اعتمادی، کہ زندگی کو بنانے اور سدھارنے کے لیے ہم تقدیر پر نہیں بلکہ تدبیر اور عمل پر بھروسا کرتے ہیں۔ ''کب مقدر کے اختیار میں ہے'' کا آہنگ اور استفہام وجود انسانی کی افضلیت اور اشرفیت کے اعلان کی طرح تھا۔ اور وہ ''آدم نو'' جس کے انتظار میں خلا کی رقاصہ نے اپنی محفل تنہا آباد کی تھی کہانیوں کے پر اسرار شہزادے، یا ققنس کی طرح اپنی خاکستر میں سے جی اٹھنے والے کسی مرد تقدیر کی طرح تھا جس کے نمودار ہوتے ہی ہماری زمین خود کو اس کے سپرد کر دے گی۔

یہ سب از حد رومانی تو تھا، بلکہ بڑی حد تک تعمیمی اور آسان حل کی طرح کا تھا، ایسا حل جسے چادر کی طرح اوڑھ اڑھا کر بڑے اور پیچیدہ مسائل اور خوف اور خون سے بھری ہوئی حقیقتوں کو ڈھانکنے کا کام لیا گیا تھا۔ لیکن یہ دلکش پھر بھی تھا، کہ انسان کا ذہن، اور خاص کر انسانوں کے بچوں کا ذہن فریب کھانے کے بہانے تراشتا رہتا ہے۔ اسے 'واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں' کی ایک صورت کہیے، یا قول سے زیادہ عمل کو معتبر جاننے کی امید کا اظہار کہیے، لیکن ہے یہ انسانی زندگی کی حقیقت، اور احمد ندیم قاسمی کے یہ مصرعے اسی حقیقت کا دوسرا نام ہیں۔

''زندگی کو سنوارنے'' کا فقرہ اس وقت تو نہیں، لیکن بعد میں مجھے کچھ کمزور لگنے لگا تھا۔ ''سنوارنا'' تو شاید کسی اچھی چیز کو اور بہتر بنانے کو کہتے ہیں؟ شاید ''سدھارنا'' بہتر ہوتا؟ لیکن شاید اس زمانے میں یہی محاورہ مقبول تھا۔ نشور واحدی صاحب کا مصرع بھی ان دنوں بہت مشہور ہوا تھا:

جب کوئی سنور گیا زندگی سنور گئی

یہ سب سہی، لیکن ''زندگی کو سنوارنا'' مجھے اب کچھ بہت اچھا نہیں لگتا۔ مگر یہ بات اس وقت میرے لیے کچھ اہمیت نہ رکھتی تھی۔ وہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے زور و شباب کا تھا۔ اس وقت ہم لوگوں کو ترقی پسند ادیبوں کے حالات جاننے، ان کی کتابیں اور رسالے پڑھنے، ان کے بارے میں باتیں کرنے کا شوق تھا۔ زبان و بیان کی اہمیت اگر تھی تو ثانوی تھی۔ احمد ندیم قاسمی کے بارے میں یہ معلومات میرے لیے زیادہ بامعنی تھی کہ وہ ذات کے سید اور ایک صوفی خاندان کے فرد ہیں اور ان کا نام احمد شاہ ہے اور پنجاب میں تمام سیدوں کی بڑی آؤ بھگت ہے، لوگ انھیں ''شاہ صاحب'' کہتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے سرکاری نوکری چھوڑ کر شعر و شاعری اور صحافت اور سیاسی کاموں کا مشغلہ اختیار کر لیا ہے اگرچہ اس میں فائدہ کچھ نہیں، بلکہ نقصان ہی نقصان ہے۔ ہم جو گلشن ادب کے نوآموز اور نو پر تھے، ہمیں یہ سب باتیں بڑی دلکش، رومانی، اور شاعر کے منصب کے عین مناسب معلوم ہوتی تھیں۔ ترقی پسند ادب نے ادیب کو ہیرو کے طور پر پیش کرنا آغاز کیا تھا اور ہم سب کسی نہ کسی نہج سے اس بات کو درست سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رشید احمد صدیقی کا یہ قول ہم میں سے اکثر کو بالکل بجا اور قابل یقین معلوم ہوتا تھا کہ برا شخص اچھا شاعر

نہیں ہو سکتا۔

یہ انجمن ترقی اردو کے لیے بڑی تحسین اور افتخار کی بات ہے کہ نئے ادب کا دور شروع ہوتے ہی انجمن نے نئی شاعری کا ایک انتخاب شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ''انتخاب جدید'' کے نام سے یہ گلدستہ آل احمد سرور اور عزیز احمد نے مرتب کیا اور انجمن نے اسے 1943 میں شائع کیا۔ اس انتخاب میں اکثر ترقی پسند شعرا نظر آتے ہیں لیکن احمد ندیم قاسمی ان میں نہیں ہیں۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اس وقت تک قاسمی صاحب کا نام بطور افسانہ نگار زیادہ مشہور تھا۔ اس وقت ترقی پسند شاعری کے دو رنگ رائج تھے، اور شاید ہمیشہ رائج رہے۔ ایک تو فیض صاحب کا رومانی، کیفیت سے بھرپور، شائستہ، تھوڑی سی محزونیت لیے ہوئے، استعارہ و تشبیہ اور نئے نئے الفاظ و تراکیب سے جگمگاتا ہوا اسلوب، اور دوسرا سردار جعفری کا بلند آہنگ، خطیبانہ، براہ راست گفتگو کا انداز، جس کی انتہائی شکل سید مطلبی فرید آبادی کی نظم میں نظر آتی تھی۔ بعد میں مجروح صاحب نے کچھ غزلوں میں اور نیاز حیدر نے اپنی تمام نظموں میں یہی اسلوب اختیار کیا۔ ''انتخاب جدید'' میں دونوں رنگوں کے محتاط نمونے ملتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کا اسلوب شعر ان دونوں سے مختلف تھا اور اسے مقبول ہونے میں دیر لگی۔

اگرچہ احمد ندیم قاسمی کے اصل شاعرانہ جوہر ان کی نظم میں نظر آتے ہیں لیکن انھوں نے غزل میں بھی کئی شعر ایسے کہے جو اس قدر مقبول ہوئے کہ کم و بیش ضرب المثل کا درجہ اختیار کر گئے:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مر جاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا
تیرے پہلو سے جو اٹھوں گا تو مشکل یہ ہے
صرف اک شخص کو پاؤں گا جدھر جاؤں گا

○

یکساں ہیں فراق و وصال دونوں
یہ مرحلے ایک سے کڑے ہیں

○

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

جہاں تک نظم کا معاملہ ہے، ندیم صاحب کی بڑی صفت یہ تھی کہ ان کے تخیل میں کچھ اس طرح کی آسمان گیری ہے جو اقبال کی یاد دلاتی ہے اور اقبال ہی سے متاثر معلوم ہوتی ہے۔ یعنی اقبال جس آسانی اور بے تکلفی سے فلک، چاند تاروں، سورج، خلائے بسیط اور زمان و مکان پر مبنی استعارے اور پیکر اپنی نظم اور غزل میں استعمال کرتے ہیں، کچھ اسی طرح کی آسماں گیری قاسمی صاحب کے یہاں بھی ہے، اگرچہ قاسمی صاحب کے یہاں اقبال جیسی تعقلاتی کیفیت اور ڈرامائی رنگارنگی نہیں۔ قاسمی صاحب کی جس نظم کے دو شعر میں نے شروع میں درج کیے ہیں ان میں بھی یہی آسمان گیری نمایاں ہے۔ یہاں زمین صرف زمین نہیں ہے بلکہ کائنات میں گھومتا ہوا، رقص کرتا ہوا ایک ماورائے انسانی، خلائی وجود ہے۔ اب ایک اور نظم کے یہ مصرعے دیکھیے:

اگر وقت سورج کی زرکار بگھی کو صرف ایک پل کے لیے روک سکتا
اگر یہ جہاندیدہ کاہن کبھی انقلابات کا راستہ ٹوک سکتا
لپکنا مگر اس کی تقدیر میں ہے پلٹنا بھی دشوار تھمنا بھی مشکل
یہ راہی قیامت میں ستا سکے گا ازل اس کی نگری ابد اس کی منزل
اگر وقت کی شاہراہیں معین ہیں، یہ شام یہ شب یہ پو یہ سویرا
تو دہکے ہوئے سرخ پہیوں کے چکر میں جل جائے گا اجنبی کا پھریرا

(ناگزیر)

پہلے یہ بات واضح کردوں کہ ''سرخ پہیوں'' سے مراد اشتراکی انقلاب وغیرہ کی سرخی نہیں، بلکہ سورج کی ''زر نگار بگھی'' یعنی وقت کا سفر ہے۔ وقت وہ انقلابی آگ ہے جو اجنبی طاقت کے پھریرے کو جلا کر خاک کر دے گی۔ نظم کو ہم مارکسی نقطۂ نظر سے تاریخ کی ناگزیریت کے نظریے پر مبنی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ تاریخ کی ناگزیریت کو بیان کرنے کے لیے احمد ندیم قاسمی نے آسمان، سورج، وقت کی شاہراہ، ابد، ازل جیسے الفاظ پر مبنی پیکر اور تصورات کا انتخاب کیا ہے۔ بعض الفاظ تو بالکل ہی اقبال کی تخلیقی بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔

میں نے قاسمی صاحب کے بہت سے افسانے اپنے زمانۂ نوجوانی میں پڑھے۔ بعض مجھے اچھے لگے، بعض نے مجھے اس لیے متاثر کیا کہ وہ اس روایتی خوبی سے معرا تھے جو احمد ندیم قاسمی کی خاص صفت بتائی جاتی ہے، یعنی پنجاب کے دیہات کی تصویر کشی۔ ویسے مجھے یہ بات ہمیشہ کچھ نامناسب لگی کہ افسانہ نگاروں کو اس طرح علاقوں میں بانٹ دیا جائے، کیونکہ پھر ان کی شخصیت انھی علاقوں کے حوالے سے متعارف اور مذکور ہوتی ہے۔ بیدی صاحب جیسے بڑے افسانہ نگار تو اس علاقائی پھندے سے بچ نکلتے ہیں، اور بیدی صاحب یوں بھی اس قدر متنوع ہیں اور ان کے تنوع کا ہر رنگ اس قدر توجہ انگیز ہے کہ ان پر کوئی لیبل فٹ نہیں آتا۔ لیکن بلونت سنگھ، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی جیسے عمدہ لیکن نسبتاً محدود افسانہ نگار نقصان میں رہتے ہیں۔

بہر حال، وقت گذرنے کے ساتھ قاسمی صاحب کا تصور میرے ذہن میں ایک روشن خیال بزرگ اور وسیع الاخلاق مدیر کی صورت میں روشن ہوتا گیا۔ سنہ ساٹھ کی دہائی میں، جب ترقی پسند تحریک اپنے معنی کھو چکی تھی (پاکستان میں اس کا حال ہندوستان سے بھی زیادہ ابتر تھا) اور ترقی پسند ادب صفحۂ ادب کے مرکز سے ہٹ کر حاشیے پر آ گیا تھا اور فیض صاحب کے سوا تمام ترقی پسند ادیبوں کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگنے کی نوبت آ رہی تھی، قاسمی صاحب نے 1963 میں ''فنون'' نکالا اور وہ بہت جلد اردو کی ادبی دنیا میں ایک اہم شخصیت کے طور پر واپس آ گئے۔ ''فنون'' ترقی پسند رسالہ نہ تھا۔ لیکن یہ جدید، یا قدامت پسند رسالہ بھی نہ تھا۔ ''فنون'' کے اوراق ہر طرح کے ادب کے لیے کھلے ہوئے تھے، بس معیار کی بلندی اور انداز کی تازگی شرط تھی۔ قاسمی صاحب نے کوئی ترقی پسند گوشوارۂ عمل جاری کرنے کے بجائے تمام ترقی پسند ادب کو زمانے کا ہم قدم ہونے اور پھر بھی ترقی پسند رہنے کی ترغیب دی۔ ہر مکتب فکر اور اسلوب فن کے لکھنے والوں کو ''فنون'' کے صفحات پر جگہ دے کر انھوں نے اس اصول کی تصدیق و توثیق کی کہ اچھا ادب لازمی طور پر کسی جھنڈے یا لیبل کا محتاج نہیں ہوتا۔

سنہ 1969 میں ''فنون'' کا جدید غزل نمبر نکلا۔ اس میں کئی خواص ایسے تھے جو اسے ضخیم نمبروں کی عام ڈگر سے الگ راہ پر قائم کرتے تھے۔ لیکن اس میں ایک خوبی ایسی تھی جو اس طرح کے کسی نمبر کو نصیب نہ ہوئی، نہ پہلے نہ بعد میں۔ اور وہ خوبی یہ تھی کہ اس میں ہر مکتب و منہاج کے اچھے شاعر شامل کیے گئے تھے اور ان شعرا کو بطور خاص جگہ دی گئی تھی جنھیں اس وقت کے ''فیشن'' کے مطابق ''جدید غزل'' کے کسی انتخاب میں شامل ہونے کا استحقاق نہ تھا۔ فہرست سے چند نام حسب ذیل ہیں:

آل احمد سرور، آنند نرائن ملا، احتشام حسین، احسان دانش، اقبال عظیم، حفیظ جالندھری، شفقت مرزا، شیر افضل جعفری، صوفی تبسم، عابد علی عابد، ماجد الباقری، محمد نبی خاں جمال سویدا، منظور حسین شور اور بہت سے دوسرے، جن میں سے بعض کا کلام اس لیے محفوظ رہ گیا ہے کہ وہ ''فنون'' کے جدید غزل نمبر میں ہے۔ اور بہت سے شعرا ایسے ہیں آج جن کے بارے میں توصیفاً کہا جاتا ہے کہ وہ ''فنون'' کے جدید غزل نمبر میں شامل تھے۔ بے خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ کم ہی پرچے ایسے ہوں گے جن کا کوئی خاص نمبر تقریباً چالیس سال گذرنے کے باوجود تازہ اور قابل مطالعہ معلوم ہو۔ وجہ ظاہر ہے۔ قاسمی صاحب کا معیار انتخاب ذاتی یا نظریاتی تعصبات سے بالاتر تھا۔ ''فنون'' کے علاوہ اور بھی پرچے تھے (مثلاً ''سویرا'') جو نئے ادب کی نمائندگی کرتے تھے، لیکن ''فنون'' جیسی وسعت نظر کسی میں نہ تھی۔

ایڈیٹر کی حیثیت سے قاسمی صاحب میں ایک بڑی خوبی تھی جس پر میں نے ہمیشہ رشک کیا۔ قلمی معاونین کو خط وہ اپنے قلم سے لکھتے تھے۔ اخیر عمر تک ان کا سواد خط بہت پاکیزہ اور حروف کی نشست بہت پختہ تھی۔ خط میں از راہ انکسار اپنا نام وہ ہمیشہ ''ندیم'' لکھتے تھے اور جو تحریر انھیں پسند آتی اس کی تعریف کرتے تھے، خواہ وہ ان کے ادبی موقف کی حمایت میں ہو یا نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے بہترین دنوں میں ''فنون'' سے زیادہ تازہ کار، فکر انگیز مضامین اور عمدہ شعر و افسانہ چھاپنے والا کوئی رسالہ پاکستان میں نہ تھا۔ کراچی کے رسالے نئی تحریروں کے بارے میں بہت محتاط، بلکہ قدامت پرست تھے لیکن قاسمی صاحب ہمیشہ نئی اور متنازعہ فیہ ہو جانے والی تخلیقات کے جویا رہتے تھے۔ انھوں نے محمد حسن عسکری پر محمد ارشاد، اور امیر خسرو، اور وزیر آغا پر رشید ملک کے طول طویل مضامین کئی قسطوں میں شائع کیے۔ ہر شخص ان کی ہر بات سے مطمئن ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، لیکن ہر شخص متفق تھا کہ ساری قسطیں بہت خیال افروز اور اعلیٰ علمی سطح کی مثال پیش کرتی تھیں۔

قاسمی صاحب نے کالم اور تنقیدیں بھی لکھیں۔ پاکستان میں کالم کے نام پر جس طرح لوگوں کی پگڑیاں اچھالی جاتی ہیں اور جس طرح کالم نگاری کو ادبی سیاست کے موثر اور مہلک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، سب اس سے واقف ہیں۔ قاسمی صاحب نے کالم نگاری کے پردے میں ذاتی حملے کرنے کا مشغلہ اختیار کرنے سے عموماً گریز کیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ قاسمی صاحب کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی، اپنے تعصبات نہیں تھے۔ وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے اختلافات، فیض صاحب کے بارے میں قاسمی صاحب کی رائے زنی، یہ سب جدید ادب کے جھگڑوں کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں قاسمی صاحب نے اپنے قلم یا زبان کو تکلیف دہ مذمتوں سے محفوظ رکھا۔ کئی سال ہوئے فراق صاحب پر میری کچھ تحریروں پر، اور خاص کر ناصر کاظمی اور احمد مشتاق کو فراق صاحب پر تفوق دینے کی بات پر آشفتہ ہو کر قاسمی صاحب نے ایک کالم لکھا تھا جس میں منجملہ اور باتوں کے انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ فراق صاحب کی زندگی میں تو فاروقی صاحب کچھ بولے نہیں، جب فراق صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں تو وہ انھیں اپنا ہدف بنا رہے ہیں۔ میں نے وہ کالم دیکھا لیکن خاموش رہا کیونکہ ایسے معاملات میں کچھ کہنا بے اثر ہوتا ہے۔ لیکن اس کالم کی اشاعت کے کئی سال بعد جب ایک معزز معاصر رسالے نے قاسمی صاحب کا وہ کالم بڑے اہتمام سے یوں چھاپا گویا وہ کوئی تازہ تحریر ہو، تو میں نے قاسمی صاحب کو لکھا کہ میں نے فراق صاحب

کے بارے میں جو لکھا وہ ان کی زندگی میں لکھا تھا۔ لیکن آج آپ کا وہ پرانا کالم یوں شائع کیا جارہا ہے گویا وہ آپ کی تازہ تحریر ہو۔

قاسمی صاحب نے فوراً جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کالم کس نے چھاپا ہے، میری اجازت تو کیا، اشارہ بھی اس میں نہ تھا۔ اور فراق صاحب کے بارے میں مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کی تحریریں ان کی حین حیات میں شائع ہوئی تھیں، ورنہ میں ایسا کچھ بھی نہ لکھتا جو میں نے لکھا تھا۔ میں نے اس معاملے کو وہیں رفت گذشت کیا کیونکہ اس سے زیادہ کی ضرورت نہ تھی۔

میں پچھلی بار جب لاہور گیا تو میں نے قاسمی صاحب سے ملاقات کا خاص اہتمام کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گذشتہ سے ایک سال پہلے میں لاہور میں اپنے بہت مختصر اور مصروف پروگرام کے باعث ان سے نہ مل سکا تھا، اگرچہ کوشش میں کوئی کمی نہ تھی۔ میں واپس آیا تو قاسمی صاحب کا شکایت نامہ ملا کہ آپ مجھ سے بے ملے چلے گئے۔ اگر آپ کو فرصت نہ تھی تو کہلا دیتے، میں ہی آجاتا۔ ظاہر ہے کہ مجھے بہت شرمندگی ہوئی اور میں نے فوراً معذرت نامہ لکھا۔ اس آخری ملاقات نے مجھے رنجیدہ کیا، کیونکہ قاسمی صاحب پر عمر رسیدگی کا اضمحلال نمایاں تھا، اگرچہ گفتگو میں پہلے ہی جیسی شگفتگی تھی۔ واپس آکر میں نے انھیں کچھ رباعیاں ان کے نام معنون کر کے بھیجیں۔ وہ انھوں نے شائع کردیں لیکن جواب میں خط کے بجائے ایک دوست کے ذریعہ شکریہ کہلا بھیجا۔

اب لاہور میں میرا کوئی بزرگ ایسا نہیں رہ گیا جس سے میں لاہور جاکر نہ ملوں اور وہ مجھے اپنے ہاتھ سے شکایت نامہ لکھے کہ آپ مل کر نہیں گئے۔

یاران رفتہ آہ بڑی دور جا بسے

(مصحفی)
29-C, Hastings Road
Civil Lines, Allahabad (U.P.)

□□□

احمد ندیم قاسمی

(سایہ دار اور فلک بوس شجر)

آپ کے فن کی بلندی کیا خوب
فرش سے عرش پہ ہے جس کا گزر
پھر دلوں میں جو اُتر جاتی ہے
نور کر دیتی ہے ہر ایک نظر
آپ کے ہیں جو زباں اور قلم
ہیں ادب کے وہی شام اور سحر
''بڑی نعمت''[1] ہے جو ہر اک تخلیق
''فن کا اجر''[2] آپ کا اپنا ہی ہنر
ہے وجود آپ کا سب کے لیے ایک
سایہ دار اور فلک بوس شجر
ہے مرے لب پہ یہی ایک دعا
ہو مبارک نئے عشرے کا سفر
بخشیں آپ اور بھی حرفوں کے گلاب
دیں ہمیں اور بھی لفظوں کے گہر

○

قطعہ

احمد ندیم قاسمی ہے ایک شخص کب؟
وہ چاند ہے، گلاب ہے نغمہ ہے شہد ہے
یعنی وہ ایک عہد ہے اپنے مقام پر
جو ایک عہد، اصل میں ہر ایک عہد ہے

ایم قمرالدین
120, Lawyers Chambers
Supreme Court
New Delhi-110001.

□□□

1. فن بڑی چیز ہے تخلیق بڑی نعمت ہے — حسن کاری کوئی الزام نہیں ہے اے دوست
2. ندیم کوئی مرے فن کا اجر کیا دے گا — میں خاک چاٹ کے بھی نشۂ ہنر میں رہوں — احمد ندیم قاسمی

جناب ایم. قمرالدین یہ نظم اور قطعہ قاسمی صاحب کی سالگرہ (20نومبر) کے موقعے پر انھیں پیش کرنے کے آرزو مند تھے لیکن ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی اور قاسمی صاحب انتقال فرما گئے۔

محمد خالد اختر

ایک آدمی، احمد شاہ نامی

احمد ندیم قاسمی کے بارے میں میں کیا جانتا ہوں؟ ایک انسان دوسرے انسان کے متعلق کیا کچھ جان سکتا ہے؟ ایک آدمی کا بہت تھوڑا روپ اس کے جاننے والوں، دوستوں اور عزیزوں کے مشاہدے کے لیے سامنے آتا ہے — صرف وہی حصہ جو خود ہمارے اندرونی وجود کے آئینے میں منعکس ہوتا ہے اور اسے زندگی کی شاہراہ پر ہمارے قریب لاتا ہے۔ باقی بہت بڑا حصہ — گراہم گرین کے الفاظ میں 'اندر کا آدمی' — اکثر ہم میں سے بیشتر کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ ایک بڑا ناول نگار دستوونسکی، طالسطائی یا ہمارا کہانی نویس منٹو شاید اس حصے کو اپنی عکسی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، ہر کوئی نہیں۔ یہ کون جانے ایک انسانی دل کے اندر کون سی امنگیں، محرومیاں، خواہشیں پرورش پاتی ہیں: کون سے بھسم کرنے والے، ابتدائی جبلی جذبات و احساسات وہاں بستے ہیں۔ ہم سب یک رنگ نہیں اور مختلف حالات اور موقعوں پر ہمارے کردار و افعال مختلف ہوتے ہیں۔ وہ چہرہ جو ایک عوامی لیڈر ہزاروں اور لاکھوں کے بے رخ مجمعوں کے روبرو پیش کرتا ہے، وہ چہرہ نہیں جو اس کے جگری یار اور لنگوٹیے ذاتی مجلس میں دیکھتے ہیں، یا جسے اس کے گھر میں اس کی بیوی اور بچے جانتے ہیں۔

اس کی گھریلو زندگی کا مجھے علم نہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ایک محبت کرنے والا، متحمل مزاج شوہر ہے اور اس نے کبھی غضب ناک ہو کر گھر کے برتن نہیں توڑے۔ گو وہ ایک کہنہ اور بلا کا سگریٹ نوش ہے، اس نے کبھی شراب نہیں چکھی اور بیئر یا وِسکی کا ذائقہ اس کے ہونٹوں کے لیے ناآشنا ہے۔ کتنی بڑی محرومی! لیکن ندیم اسے قطعاً محرومی نہیں جانتا اور شراب نوشی کو 'سات فقہی گناہوں' میں سے ایک گردانتا ہے۔ اپنے ایامِ شباب میں محکمۂ ایکسائز کی دو سال کی ملازمت بھی اسے اس لااُبالی، معصیانہ راہ پر نہ لا سکی۔ ہم اس اخلاقی ضبط کے لیے اس کا احترام کر سکتے ہیں یا خود مبتدی متوالے ہونے کی وجہ سے اس پر رحم کھا سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے ایک درویشانہ اور دیندارانہ ماحول میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی اور اس کے بچپن کے اخلاقی ٹیبو اس کے خون میں رچ بس گئے ہیں۔ اس نے ان ٹیبوؤں اور تحریموں سے چھٹکارا پانے کے جتن بھی نہیں کیے، کیونکہ وہ اس کے لیے کڑے اخلاقی قوانین ہیں جن سے انحراف ذلت اور خواری ہے۔ میں سمجھتا ہوں ان اخلاقی تحریموں نے اس کی شخصیت کو کسی قدر گھونٹ کے رکھ دیا ہے۔ اس کی گفتگو پُرلطف، دل پذیر اور شگفتہ ہوتی ہے، مگر اس کے ہمراہ گفتگو کے راستے پر کچھ دیر چل کر تم ایک ایسے مکان پر آ نکلتے ہو جس کا آہنی دروازہ اور دریچے بند ہیں اور جس میں سوائے اس کے کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔ اس بے ہوا اور اُجاڑ مکان میں وہ اکیلا رہتا ہے، اپنے غالب اخلاقی آسیبوں، پچھتاووں، نامرادیوں اور پشیمانیوں کے ساتھ! ندیم کے دو تین قریبی دوست ہیں، جن میں میں فخر سے خود کو بھی شمار کرتا ہوں، مگر میرا خیال ہے اس کا کوئی ایسا ہمراز نہیں جس کے سامنے اس کی اندرونی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہو۔ اپنی تنومند، الھڑ جوانی میں اس نے ضرور کسی سرگیں آنکھوں والی دیہاتی 'روحی' سے سچی محبت کی ہوگی، مگر اس کے دوست اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور وہ اس کا ذکر تک نہیں کرتا۔ یہ کہی نہ جانے والی بات ہے، قدرے شرمناک، 'ہش ہش'، مخربِ اخلاق قسم کی چیز! اگر ندیم نے کبھی اپنی آپ بیتی لکھی تو بلاشبہ وہ ایک بے حد دلچسپ صحیفہ ہوگی — اس عہد کی ادبی اور تاریخی شخصیات کے متعلق چمکتی دمکتی یادداشتوں سے بھری۔ ہاں اس میں ندیم کس حد تک موجود ہوگا، میں نہیں کہہ سکتا۔

ہاں، میں احمد ندیم قاسمی کے متعلق کیا جانتا ہوں؟ شاید بہت کم۔ شاید اتنا جتنا ایک دوست کو جاننے کا حق ہے۔ ہر انسان اپنی ذات میں ایک جزیرہ ہے اور محبت ہی دو انسانوں کو ایک دوسرے سے ملانے کا واحد پل ہے۔ میں احمد ندیم قاسمی سے اس وقت سے محبت کرتا ہوں جب قسمتوں نے ہمیں چھتیس چھتیس برس پہلے صادق ایجرٹن کالج بہاولپور کے ایوانوں میں اکٹھا لا پھینکا۔ میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا، وہ تھرڈ ایئر کا۔ مگر خوش قسمتی سے ہم ایک ہی پروفیسر کے گروپ موسوم بہ 'سولجرز' میں شامل تھے۔ 'سولجرز' کے اجلاس ہر ہفتے

یہ مضمون پہلی بار ''افکار'' کراچی (جنوری، فروری 1975) کے ندیم نمبر میں شائع ہوا تھا۔ اجمل کمال کی ادارت میں شائع ہونے والے مقتدر جریدے ''آج'' کراچی کے محمد خالد اختر پر خصوصی شمارے (شمارہ نمبر 52 فروری 2005) میں بھی یہ مضمون شامل کیا گیا ہے۔ یہ مضمون ''آج'' کے شکریے کے ساتھ ''اردو دنیا'' میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ہمارے پروفیسر کی صدارت میں ہوتے تھے۔ ہائی اسکول ہی سے مجھے رائیڈر ہیگرڈ، ڈیفنی مورکو پر اور رابرٹ لوئی اسٹیونسن کے مہماتی ناول پڑھنے کی لت پڑ گئی تھی اور میں ان کے طرز میں انگریزی میں جنگلی آدمیوں اور بحری قزاقوں کی کہانیاں لکھتا رہتا تھا۔ میں اپنے ذہن کی ایک عجیب خیالی دنیا میں گم صم رہتا تھا، مکمل طور پر مگن! ان میں سے چند کہانیاں میں نے 'سولجرز' میں پڑھیں، جن پر مجھے کافی داد ملی — اگرچہ گروپ کے چند لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے ان کو کہاں سے نقل کیا ہے۔ ندیم، جو اس وقت احمد شاہ ندیم تھا، 'سولجرز' کے اجلاسوں میں اپنی نئی نئی نظمیں سنایا کرتا۔ ان نظموں میں ایک نئی نغمگی، تازگی اور اُجلاپن ہوتا تھا اور ہم ان کے جادو تلے آ گئے تھے۔ یہ گٹھے بدن کا، فراخ رو دیہاتی نوجوان ایک فطری شاعر تھا اور اس وقت بھی ہم اس سے مستقبل میں بڑی چیزوں کی توقع رکھتے تھے اور ہمیں یقین تھا کہ وہ جلد ہی شعر و ادب کی دنیا میں اپنا مقام حاصل کرے گا۔ وہ اپنے پروفیسر کا چہیتا طالب علم تھا اور فورتھ ایئر میں آ کر ''سولجرز' گروپ کا سیکرٹری بن گیا تھا اور کالج میگزین ''نخلستان'' کے اردو حصے کا ایڈیٹر بھی! ادب سے ہمارا سانجھا شغف رفتہ رفتہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آیا اور جلد ہی ایک ایسی گہری جذباتی اور دلی وابستگی کی بنیاد بن گیا جو اوائل جوانی میں ہی ممکن ہے اور زندگی کی حسین ترین چیزوں میں سے ایک ہے۔ تقریباً ہر شام کو میں ندیم کے ہاسٹل کے مانیٹر والے بالائی کمرے میں ہوتا۔ وہ مجھے اپنی اس روز کی نظم سناتا اور میں بھی کبھار اسے اپنی لکھی ہوئی کسی مہماتی کہانی کا حصہ سناتا۔ ان دنوں میں بڑا ہو کر اسٹیونسن کی طرح لڑکوں کے لیے مہماتی ناول لکھنے کی امنگ رکھتا تھا۔ (میں فوری طور پر ایک بحری قزاق بھی بننا چاہتا تھا، مگر اس خواہش کی تکمیل میں کئی ایک دقتیں حائل تھیں۔) آہ اوائل جوانی کے سنہری سپنے! یہ شاذ و نادر ہی پورے ہوتے ہیں، لیکن زندگی کی روکھی پھیکی، اُکتا دینے والی داوی میں ان کی دمک مرتے دم تک انسان کے ساتھ رہتی ہے۔

میں اپنے اوائل جوانی کے ان ایام کی یادوں میں زیادہ دیر اٹکنا چاہتا ہوں، مگر ندیم نے ''جلال و جمال'' کے طویل دیباچے میں ان ڈھالنے والے (formative) دنوں کی اتنی کہانی پہلے ہی لکھ دی ہے جتنی وہ بتانا مناسب سمجھتا تھا۔ اس کی صلاحیتوں کا رخ مختصر افسانے کی طرف موڑنے میں غالبًا میرا بھی تھوڑا بہت ہاتھ ہے۔ میرے اکسانے پر ندیم نے رائیڈر ہیگرڈ کے طرز میں ایک لمبے مہماتی ناول کا آغاز کیا۔ اس نے اس کے اسّی یا نوّے صفحات لکھ لیے اور مجھے پڑھنے کے لیے دیے۔ اور پھر اس نے ہمت ہار دی — یہ اس کا genre نہیں تھا۔ وہ پنجاب کے دیہات کے اصلی لوگوں کی اصلی جیتی جاگتی کہانیاں لکھنا چاہتا تھا۔ بحری قزاق اور جنگلی آدمی اس کی طبیعت کو راس نہ آئے۔ میں نے اسے مختصر افسانے لکھنے کا حوصلہ دلایا اور جلد ہی وہ اس کام میں جٹ گیا۔ کئی دفعہ شام کو گھر سے کالج گراؤنڈ آتے ہوئے میں اُسے گھاس پر لیٹے یا کسی بنچ پر بیٹھے اپنا افسانہ لکھنے میں منہمک پاتا۔ پہلی ہی کہانی شاید اختر شیرانی کے رسالے ''رومان'' میں اشاعت کے لیے قبول کر لی گئی جس سے اس کی ہمت بندھی اور اس نے چند ایک اور کہانیاں لکھیں۔ (ان میں سے بعض کہانیاں بعد میں اس کے پہلے مجموعے ''چوپال'' میں اشاعت پذیر ہوئیں۔) اس طرح شاعر کے علاوہ وہ افسانہ نگار بھی بن گیا۔ ان دونوں اصناف سے وہ ان دنوں آسانی اور آسودگی کے ساتھ نپٹ لیتا تھا اور کالج سے فراغت کے بعد اس نے اپنے فنِ افسانہ نگاری میں کمال حاصل کرنے کے لیے کئی سال بڑی ریاضت کی۔ اس کی مشہور اور بڑی کہانیاں کئی سال بعد کی پیداوار ہیں، مگر بہاول پور کالج کے وہ دو سال وہ عرصہ تھا جب اس کے ادبی ذوق کی کونپلیں نکلیں اور مستقبل کا شاعر اور افسانہ نگار پیدا ہوا۔

کالج سے فراغت کے بعد ندیم بہاول پور سے چلا گیا اور وہ پُر اذیت اور کرب ناک مہینے جو اس نے لاہور میں ڈگری ہاتھ میں لیے کسی چھوٹی سی ملازمت کی تلاش میں جوتیاں چٹخاتے گزارے، ان کی تلخی اور ہولناکی وہ ابھی تک نہیں بھول سکا۔ جس دفتر میں وہ جاتا 'کوئی اسامی خالی نہیں' کی تختی اس کا خیر مقدم کرتی۔ باہر کی دنیا کی نامہربانی اور بے دردی نے اس خام دہقانی نوجوان کے حساس دل کو بری طرح مجروح کیا اور کئی بار اس نے خودکشی کرنے کی ٹھانی۔ اپنی بوڑھی ماں کی محبت اور اپنے ستارے میں ایمان نے اسے یہ انتہائی قدم اٹھانے سے روکا۔ بہت سے دن اس نے بغیر کچھ کھائے پیے گزارے۔ کئی راتیں لاہور کے گلی کوچوں میں چلتے چلتے کاٹیں۔ اس سارے عرصے میں ہم ایک دوسرے سے مستقل خط و کتابت کرتے رہے۔ اس کے خط شدید جذبات سے بھاری، لبریز اور لمبے ہوتے تھے — میرے پاس بیرنگ آتے تھے، کیونکہ ڈاک کے عام لفافے کا ٹکٹ اتنے فراواں مواد کی ترسیل کے لیے کفایت نہیں کرتا تھا۔ ہر خط میں وہ اپنی بوڑھی ماں کا ذکر ضرور کرتا جس کی کوکھ نے اسے جنا تھا اور جو اس کے نزدیک ساری دنیا کی عظیم ترین عورت تھی۔ ندیم اپنی ماں کو حقیقتاً پوجتا تھا۔ اس کی دل جوئی کی خاطر، اس خاطر کہ وہ اپنے بیٹے کے کارناموں پر غرور کر سکے، وہ ادب کے آسمان پر اپنا نام درخشاں سونے کے حروف میں رقم کرنے کے لیے تڑپتا۔ میں ندیم کو پنسل سے لکھے خطوں کے ذریعے جواب دیتا (ان دنوں میں ہمیشہ پنسل سے لکھا کرتا تھا)۔ وہ عموماً نوجوانی کے لاابالیانہ ناسٹلجیا، کھلے سمندروں، بادبانی جہازوں

اور بحری قزاقوں کی باتوں سے معمور ہوتے تھے۔ (میں نے بحری قزاق بننے کا مصمم ارادہ کر رکھا تھا اور یہ یقین رکھتا تھا کہ اس کے علاوہ کوئی اور کیریئر مجھے راس نہیں آ سکتا۔) نوخیز جوانی کی متوالی خود پرستی اور کھری خودغرضی میں ندیم کے دکھوں اور اذیتوں کی داستان مجھے ضروری حد تک دل گرفتہ نہ کرتی اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کے لیے پُر درد خطوط پڑھنے کے بعد میں خون کے آنسو روتا تھا۔ خودنگر اور خودرحمی سے مغلوب نوجوانوں نے اکثر ایسے ناسٹیلجک خطوط ایک دوسرے کو لکھے ہیں۔ ندیم کے چند خط میرے باپ کے ہاتھ آ گئے۔ وہ گھر کے پتے پر بھیجے جاتے تھے اور میرا باپ تجسس کی وجہ سے انھیں کھول کر پڑھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک خط اس نے سارے کنبے کے سامنے چٹخارے لے لے کر اور کٹیلی طنزیہ رائے زنی کے ساتھ پڑھا۔ (میں غصے اور شرم سے کانوں کی لوؤں تک سرخ تھا!) اسے پڑھنے کے بعد اور نوجوانی کی پُر جوش جذباتیت پر کٹ کٹ کرتے ہوئے اس نے اس خط کے ورق میری طرف ان الفاظ کے ساتھ پھینکے، ''کون ہے تمھارا یہ دوست؟ کیا تم سمجھتے ہو اس کی دماغی حالت درست ہے؟ میرے خیال میں وہ سراسر پاگل ہے۔'' میں تعجب کرتا ہوں کہ اگر میرا باپ ندیم کے نام لکھا ہوا میرا کوئی خط پڑھ لیتا تو اپنے بیٹے کے متعلق وہ کیا رائے قائم کرتا! میری بحری قزاق بننے کی پُر جوش امنگ اس اچھے آدمی کو روئیں روئیں تک ہلا دیتی۔ وہ مجھے آئی.سی.ایس. کے مقابلے کے امتحان میں بٹھانا چاہتا تھا۔ وہ ایک میٹر آف فیکٹ قسم کا، دنیادار، سمجھ دار آدمی تھا — ایک ہر دل عزیز، محنتی اور قابل ریونیو آفیسر۔ اس کی شخصیت میں مقناطیسیت تھی، گفتگو میں چمک، اور لوگ، چھوٹے بڑے، اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے اور مجھے شک ہے کہ اپنی دنیوی کامیابی، خوش لباسی اور دیہی قیاس آرائیوں کے باوجود اپنے اندرونی وجود میں وہ شاعری کی رمق کے بغیر نہیں تھا، کیونکہ اس کی میز کی دراز میں اولیور گولڈ اسمتھ کی ''وکر آف ویکفیلڈ'' کا ایک دبیز، سنہری حاشیے کا نسخہ موجود رہتا تھا۔ وہ اکثر اس کتاب کو بڑی مسرت سے پڑھتا اور ہمیشہ مجھے اس کتاب کو پڑھنے کی تاکید کرتا۔ شاید اصل اندرونی آدمی ویکفیلڈ کے پادری کی طرح سادہ لوح، سادہ دل اور بے غرض تھا اور ظاہر ملازمت کی مصروفیتوں اور ماحول کا چڑھا ہوا ملمع تھا۔ (عجیب طور سے، اقبال نے اسے کبھی اپیل نہ کیا اور میں نے اسے کبھی اقبال کا کلام پڑھتے نہیں دیکھا۔ افرنگی قالین اور صوفوں پر اعتراض، پہاڑوں میں بسیرا کرنے کی تلقین اس کے لیے ناقابلِ فہم تھی — صاف پاگل پن!) وہ میری مصنف بننے کی کوششوں پر دانت پیستا اور ناراضگی کا اظہار کرتا۔ ادب سے میرا انہماک اس کے نزدیک وقت کا ضیاع تھا۔ اس کی جگہ بھلا میں آئی.سی.ایس. کے مقابلے کے امتحان کی تیاری کیوں نہیں کرتا تھا؟ اب میں کبھی کبھار اپنے آپ سے پوچھتا ہوں، کیا میرا باپ صحیح نہیں تھا؟ کیونکہ برسوں کی خوش فہمی اور جگر سوزی اور جانکاہی کے بعد میں اس حقیقت کو جان گیا ہوں کہ میں ایک غیر اصلی، فرضی چیز ہوں، کہ ایک تخلیقی مصنف بننے کے قدرتی جوہر دیوتاؤں نے مجھے ودیعت نہیں کیے، کہ میں احمقانہ اور بے فائدہ طور پر ایک سراب کا پیچھا کرتا رہا ہوں۔ میں کبھی اسٹیونسن کی ''ویئر آف ہرمسٹن'' اور ''ماسٹر آف بیلنٹرے'' جیسی کتابیں نہیں لکھ سکتا یا چھپوا سکتا! اگر میں اپنے باپ کی نصیحت پر عمل کرتا تو شاید زندگی کے کسی اور میدان میں اپنی ہستی کی تکمیل اور آسودہ خاطری اور خوشی پا لیتا۔ مگر اب اپنے خول سے برآمد ہونا میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ افسوس، اب وقت گزر چکا!

اس بے ربط غیر متعلق انحراف کے لیے مجھے معاف کرو، مگر ندیم پر یہ مضمون ان دو دوستوں کی کہانی بھی ہے جو جواں سالی کی امنگوں اور سنہری سپنوں سے مخمور، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، ادب و سخن کی وادی میں ظفر و فتح یابی کے جھنڈے گاڑنے نکلے۔ ان میں سے ایک قدرتی شاعر اور کہانیاں کہنے والا تھا اور اپنی منزل پانے میں کامیاب ہوا، دوسرا بناوٹی (Fake) تھا اور راہ میں تھک ہار کر رہ گیا، مگر اس کا کیا؟ دو دوستوں میں سے ایک نے کامرانی پائی تو کیا یہ دوسرے دوست کی بھی کامرانی نہیں تھی؟ کیا دوسرے دوست نے بھی اس پُر تکان رہ نوردی میں خوش آواز دیویوں کے اُلوہی نغمے نہیں سنے؟

ہماری لگاتار خط و کتابت تقریباً ایک سال تک جوش و خروش سے جاری رہی۔ کاش میں نے ندیم کے اس زمانے کے کچھ خطوط سنبھال کر رکھے ہوتے! وہ اب میرے پاس نہیں۔ ندیم نے میرے کچھ خطوط بحفاظت رکھے، اور جب اس کی پہلی کہانیوں کی کتاب ''چوپال'' دارالاشاعت پنجاب کے مطبع خانے سے چھپی تو ان خطوط کے کچھ ٹکڑے کتاب کے میرے نام انتساب میں درج تھے۔ ''چوپال'' میں ندیم کے ابتدائی زمانے کی کہانیاں ہیں اور یہ کتاب غالباً اب بازار میں نہیں ملتی۔ یہ خط و کتابت ایک سال بعد کچھ کم ہونے لگی۔ ہم دونوں اس نوحہ خوانی سے کچھ اُکتا گئے اور دوسری دلچسپیوں اور مشغلوں نے ہماری توجہ اپنی جانب کھینچ لی۔ بالآخر یہ تقریباً ختم ہی ہو گئی۔ وہ کیسا زمانہ تھا! میں ندیم کے متعلق نہیں کہہ سکتا لیکن خط لکھنا اب میرے لیے ایک مشکل، کٹھن اور اُکتا دینے والا مرحلہ بن کر رہ گیا ہے۔

لاہور میں اس بے کاری اور مایوسی میں ندیم کو بالآخر ایک سہارا ملا، ایک دوست جس نے اپنی شفقت کے پروں میں لے لیا اور جس کے پاس وہ اپنے غم و اندوہ کا تریاق ڈھونڈنے کے لیے جانے لگا۔ یہ اختر شیرانی، تپتے جذبات

اور ایروس (Eros) کا شاعر تھا۔ وہ بالکل مختلف رنگ ڈھنگ کے آدمی ایک دوسرے کے قریب کیوں کر آ گئے، مجھے بڑا عجیب لگتا ہے۔ اختر شیرانی اسکاٹ شاعر رابرٹ برنز کی طرح ایک شرابی اور عیاش تھا۔ مکمل آزاد مشرب اور دائمی رنگیلا عاشق! ندیم تب کالج سے نکلا ہوا ایک خام، صالح نوجوان شاعر تھا جس کے لیے اپنے سے پندرہ سال بڑے شاعر کی اخلاقیات یقیناً بے حد کریہہ اور نفرت انگیز ہونی چاہیے تھیں۔ اختر شیرانی ان دنوں ایک ماہانہ رسالہ ''رومان'' نکالتا تھا اور ندیم کی کچھ چیزیں، نظمیں اور کہانیاں، ''رومان'' میں چھپیں۔ پنجابی برنز اپنے رند ہونے کے باوجود ایک فن کار تھا۔ اس نے اپنے نوجوان قلم کار کا جوہر بھانپتے ہوئے اس کا حوصلہ بڑھایا اور اسے اپنے پاس آنے جانے کی اجازت دی۔ مجھے یاد ہے ندیم نے مجھے اپنے ایک خط میں لکھا، ''تم لاہور آؤ گے تو میں تمھیں اختر شیرانی سے ملاؤں گا۔ اس جیسا پیارا آدمی میں نے اور کوئی نہیں دیکھا۔'' معلوم ہوتا ہے اختر شیرانی ایک بڑا فراخ دل مخلص تھا اور دردمندی اور انسانی محبت کے جذبات اس میں کوٹ کوٹ کر بھرے تھے۔ ندیم کو کئی بار اختر کے گھر پناہ ملی۔ اختر کے اپنے وسائل محدود تھے، مگر اس نے کئی بار ندیم کو اپنے ہاں زبردستی کھانا کھلایا اور ایک دو بار اسے کچھ رقم دینے کی بھی کوشش کی۔ میرا خیال ہے ایک وقت ان کے تعلقات کافی گہرے تھے اور ندیم اپنا بہت سا وقت شرابی اور عیاش مزاج شاعر کی صحبت میں گزارتا تھا۔ اختر شیرانی کے لیے بڑی محبت اور قدر کے باوجود ندیم نے خود کو پنجابی برنز کے رنگ میں نہ رنگنے دیا، یا جیسا کہ ندیم کہے گا، اس کا دامن معصیت سے آلودہ نہ ہوا اور اس کی جوانی بے داغ رہی۔ اس نے اپنے ہر قسم کے اخلاق سے آزاد مربی کے ساتھ ہم نوشی سے اجتناب کیا اور نہ اس کی ہمرہی میں سلماؤں کے شکار کو نکلا ـــ ورانت کے اخلاقی مجوز بہت سخت تھے۔

انھی دنوں ندیم نے ایک خط میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ 'نورالٰہی محمد عمر' کی طرح ہماری چیزیں دونوں کے مرکب نام 'ندیم خالد' کے نام سے چھپیں۔ میں اس میں متامل تھا اور میں نے اس تجویز سے اتفاق نہ کیا، جس کا میرے خیال میں ندیم نے قدرے برا مانا۔ مگر میرے پاس اپنی وجوہ تھیں۔ میں حقیقتاً اپنا نام چھاپے میں دیکھنا چاہتا تھا، ادبی فلک پر جگمگانا چاہتا تھا، مگر اپنے دوست کی نگارش کے کریڈٹ میں مجھے شریک ہونے میں عذر تھا اور ندیم کی نظموں اور کہانیوں پر اپنا نام دیکھ کر میری انا کو کوئی تسکین نہیں ہو سکتی تھی۔ اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھنے کا آسان طریقہ یہ ضرور تھا مگر میں ادھار مانگے ہوئے کلاہ اور چغے میں ادب کی دنیا میں نہیں گھسنا چاہتا تھا، اور ساجھی سارنگ نوازی مجھے پسندیدہ نہ تھی۔ ہم کبھی اچھے ہم کار (collaborator) نہ ثابت ہوتے اور ہماری دوستی اس تجربے سے صحیح سلامت بچ کر نہ نکل پاتی۔ میں نہیں جانتا کہ نورالٰہی اور محمد عمر کے باہمی تعلقات کیسے تھے اور ان میں سے ایک، دوسرے کے بارے میں کیسے خیالات رکھتا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ ہم کاری کے چند سالوں کے بعد نورالٰہی محمد عمر کی صورت سے سخت بیزار ہو گیا ہو اور محمد عمر نورالٰہی کو سامنے آتا دیکھ کر پاس کی کسی گلی میں ڈبکی لگا جاتا ہو۔ جذباتیت ہمیشہ احمد ندیم قاسمی میں رچی بسی رہی ہے۔

وہ ادبی حلقوں میں جلد ہی جانا پہچانا ہو گیا۔ اس کی شاعری میں ایک سادگی، نغمگی اور معصومیت تھی جو ہر ایک کو بھا گئی۔ اس کی کئی غزلیں، سیاسی نظمیں ''انقلاب'' میں چھپیں اور ان میں سے ایک، جو کافی اچھی اور زوردار تھی، اس نے 'سولجرز' کی میٹنگ میں پڑھ کر سنائی۔ اختر شیرانی کے بعد مولانا عبدالمجید سالک نے جواں سال شاعر کو اخلاقی اور مالی سنبھالا دیا۔ سالک نیاز مندانِ لاہور کے حلقے کا روحِ رواں، انقلاب میں ناقابلِ تقلید نکھری نثر میں ''افکار و حوادث'' کا راقم، ادبی اور سیاسی حلقوں میں بارسوخ تھا۔ اس کی دلچسپ، شگفتہ، چٹکلوں سے بھری گفتگو نے ندیم کو گرویدہ کر لیا اور ندیم نے بھی اس کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ عمروں کے تفاوت کی وجہ سے ندیم نے ہمیشہ اپنے تعلقات میں حفظِ مراتب کو ملحوظ رکھا۔ مولانا عبدالمجید سالک کے توسط سے وہ 'نیاز مندانِ لاہور' کے گروپ کے مشاہیر اور دوسرے ادبی لوگوں سے متعارف ہوا۔ دارالاشاعت پنجاب کے امتیاز علی تاج کو اپنے بچوں کے ہفتہ وار رسالے ''پھول'' کے لیے ایک اچھے مدیر کی جستجو تھی۔ سالک کا امتیاز علی تاج سے بڑا یارانہ تھا، اور جیسا کہ جاننے والے جانتے ہیں (اور یہ کہنا بے جا نہیں) تاج کی مشہور تمثیل ''انارکلی'' کی نگارش کو سنوارنے، اس کے اسلوب کو نکھارنے میں سالک اور پطرس نے بڑی کاوش کی تھی ـــ کیونکہ ''چچا چھکن'' کا مصنف بھی اوریجنل ادیب نہیں تھا۔ سالک نے تاج سے ''پھول'' کی ادارت کے لیے ندیم کی سفارش کی، بلکہ ندیم کو اپنے دوست کے حوالے کر دیا۔ اس طرح یہ دیہاتی خام نوجوان ساٹھ روپے ماہوار پر ''پھول'' کا مدیر تعینات ہوا۔ دارالاشاعت پنجاب کا اصل مہتمم اور منصرم تاج کا بڑا بھائی سید حمید علی ایک مزاج دار، سخت گیر شخص تھا، ناک بہنے کی مستقل بیماری کی وجہ سے چڑچڑا اور بے حوصلہ۔ ندیم نے ''پھول'' کو بچوں کا ایک اول درجے کا پرچہ بنانے میں بھرپور محنت کی۔ لیکن وہ سید حمید علی کا تنخواہ دار ملازم تھا اور اس ادارت میں اسے خوشی حاصل نہ ہوئی۔ وہ اس ملازمت سے چمٹا رہا، کیونکہ روح اور جسم کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے دو وقت کی روٹی ضروری تھی۔ سالک، جو ندیم سے اپنے بیٹے کی سی محبت کرتا تھا، اس کی دل جوئی کے لیے اکثر وہاں

آنکلتا، اس کی نمی اور اداسی کو بھانپ کر ہنسی مذاق کی باتیں کرتا اور پھر کسی نہ کسی حیلے سے حمید علی سے اجازت لے کر اسے کسی ہوٹل میں کباب کھلانے لے جاتا۔ ''پھول'' میں ندیم نے بچوں کی کتنی ہی اچھی نظمیں لکھیں۔ سالک کے کہنے پر ندیم نے اپنی کہانیاں کتاب کی صورت میں طباعت کے لیے جمع کیں اور سید حمید علی اس کے جملہ حقوق دو سو روپے میں خریدنے پر راضی کیے گئے اور اس کی پہلی کتاب موسوم بہ ''چوپال'' دارالاشاعت پنجاب کے مطبع سے شائع ہوئی۔ ایک مصنف کی پہلی کتاب اس کے لیے ایک بڑا ناقابلِ یقین واقعہ ہوتی ہے اور بعد کی زندگی میں کوئی مسرت، اس پہلی کتاب کی مسرت کی طرح تاباں نہیں ہو پاتی۔ ایک دبیز، مجلد کتاب کی پیشانی پر اپنا نام دیکھ کر خوشی اور غرور سے وہ کچھ دن ہوا میں اڑا ہوگا۔ ''چوپال'' میرے نام منسوب تھی اور اس نے اس کی ایک جلد مجھے بھی بھیجی۔ میں اس کی خوشی میں برابر کا شریک ہوا۔ میں اپنے دوست کی کتاب کو چھپا ہوا پا کر اتنا خوش تھا جیسے یہ کتاب خود میں نے لکھی ہو۔ کافی عرصہ میں ''چوپال'' کو اپنے سرہانے تلے رکھ کر سوتا رہا۔

ان دنوں میں ہی ندیم کی ایک اور کتاب ایک ہندو مہاشے کے نام سے چھپی۔ میں نے وہ کتاب نہیں دیکھی اور میں نہیں سمجھتا کہ اس کا نسخہ اب بازار میں کہیں موجود ہے۔ یہ رسولِ اکرم کی سوانح تھی اور مہاشے جی نے اس کے لکھنے کا ندیم کو تین سو روپے معاوضہ دیا اور پھر کتاب کو اپنے نام سے شائع کر دیا۔ یہ غالباً ڈھائی تین سو صفحات کی پورے سائز کی کتاب تھی، ندیم کی تین چار ماہ کی جانکاہی کا نتیجہ۔ یہ ایک نادار فاقہ کش مصنف کے استحصال کی ایک دلچسپ مثال تھی — اور یہ غالباً واحد مثال نہیں! ندیم اب شاذ ہی اس کا ذکر کرتا ہے۔ مہاشے جی کی چال بازی اور کتاب کا ضیاع اسے بھول چکا ہے۔ اس کتاب میں غالباً کوئی ادبی خوبی نہ تھی۔

وہ دارالاشاعت پنجاب سے قریب قریب ایک سال منسلک رہا اور پھر اپنے ایک رشتہ دار میجر کی معاونت سے محکمۂ ایکسائز میں سب انسپکٹر جا لگا۔ اس ملازمت کے فرائض اس کی فطرت کے بالکل منافی تھے اور اس نے خود کو پانی سے باہر آئی ہوئی مچھلی کی طرح محسوس کیا ہوگا۔ اسے کئی بار ایسے کام کرنا پڑے جو وہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ یقینی ہے کہ ایکسائز کے محکمے میں ایسا سیدھا سادا، مکر و حیلہ سے عاری، رقیق القلب عہدے دار کبھی بھرتی نہیں ہوا ہوگا۔ پھر بھی میرا قیاس ہے کہ اس کی زندگی کا وہ ایکسائز انسپکٹری کا عرصہ نسبتاً خوشی اور خاطر جمعی کا دور تھا — ایک اچھی آرام دہ فراغت کی سرکاری ملازمت، معاش کی طرف سے اطمینان، خوش باش بے فکرے دوستوں کی صحبت — زندگی بری نہیں تھی! اسے قمار بازوں، شرابیوں، چرس پینے والوں اور انسانی سوسائٹی کی تلچھٹ سے ملنے جلنے، ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور اس نے دریافت کیا کہ ان میں سے بعض کا دل سونے کا تھا اور روح معصوم! وہ صرف اپنے حالات کے مارے تھے اور عزت دار اور کامیاب لوگوں سے زیادہ خلوص اور دردمندی اپنے اندر رکھتے تھے۔ یہ ماحول ایک کہانیاں لکھنے والے کے لیے ایک اچھا کارآمد اسکول تھا — کم از کم ایک ٹی ہاؤس سے بہتر!

بلاشبہ وہ اس ملازمت کی جکڑ بند سے بالآخر اکتا گیا۔ وہ سب انسپکٹری کے مخصوص سانچے میں نہ ڈھل سکا اور اپنے دوستوں اور عزیزوں کی ناراضگی کی پروا کیے بغیر ایک صبح اس نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ پھر لاہور میں اپنے مقدر کے ستارے کی جستجو میں آ گیا۔ اس کے لیے ایک شاعر اور کہانی لکھنے والے کے سوا اور کوئی کیریئر نہ تھا!

بہاولپور کالج سے بی۔اے۔ کرنے کے بعد — سال 1939 میں — میں لاہور کالج میں داخل ہوا؛ اس لیے نہیں کہ قانون سے یا کسی اور دنیوی کیریئر سے مجھے کوئی لگاؤ تھا بلکہ محض اس وقت تک دم لینے کا وقفہ حاصل کرنے کے لیے جب میں بحری قزاق بن سکتا تھا یا تبت میں جا کر دلائی لاما کے چرن چھو کر مکتی حاصل کر سکتا تھا۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اپنی طبیعت میں کسی بل کی وجہ سے نارمل دنیاوی سانچے میں نہیں ڈھل سکتے اور جن کے لیے ہمیشہ انوکھے رومانی خوابوں میں جینا مقسوم ہوتا ہے۔ قانون سے بھلا مجھ کو واسطہ! میں جو فطرتاً ایک لاقانونی اور جنگلی مخلوق تھا۔ وہ لوگ جو میری طرح خوابوں میں رہتے ہیں، اکثر شرمیلے، اپنے ہم جنسوں سے خائف اور مطلقاً غیر عملی ہوتے ہیں اور ایسا ہی میں بھی تھا — ایک انیس سالہ بھولا بھالا، جھجکنے والا لڑکا، زندگی کی شکست و ریخت میں مار کھا جانے والا!

ندیم تب اپنی ایکسائز انسپکٹری سے بھاگ آنے کے بعد لاہور میں تھا اور ہم اکثر ملا کرتے۔ اس زمانے کا لاہور، ملک کی تقسیم سے پہلے کا لاہور، ادبی ہنگاموں سے پُر بہار تھا۔ ''ادبِ لطیف''، ''سویرا'' جیسے خالص ادبی پرچے کافی تعداد میں چھپتے تھے اور پڑھے جاتے تھے۔ تب کے لاہور کو ہم صحیح معنوں میں علم و فن کی آماج گاہ کہہ سکتے ہیں۔ اردو زبان کے چوٹی کے نثر نگار، افسانہ نویس اور شاعر لاہور میں رہتے تھے، اس دھڑکتے ہوئے، کثیرالآباد تاریخی شہر کی فضا کو اپنی صلاحیتوں کے اجالنے کے لیے سازگار پاتے ہوئے۔ اس وقت کا لاہور کہاں گیا؟ اب ادب کے اجارہ دار پروفیسر اور ڈاکٹر رہ گئے ہیں یا لمبے بالوں والے، چشمہ لگے، انٹلکچوئل نوجوان، جو چائے خانوں میں بیٹھ کر کامیو اور سارتر اور پاؤنڈ پر بحثیں کرتے ہیں اور خود کو ان سے کسی طرح کم نہیں جانتے!

ندیم مجھے اپنے ہمراہ چراغ حسن حسرت کے ہاں لے گیا۔ حسرت کی ادارت میں ان دنوں ہفتہ وار رسالہ ''شیرازہ'' نکلا کرتا تھا، اردو کا ایک قسم کا ''پنچ'' میگزین، جس کا میں ایک مشتاق قاری تھا اور جس میں اپنے نام کو چھپے ہوئے دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس بے عیب اردو نثر لکھنے والے سے مل کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ شلوار اور قمیص میں جھکی ہوئی گھنی مونچھوں والا ایک تندخو، ان گھڑ، نیم شیم شخص، میری ایک ادبی آدمی کی ذہنی تصویر کے بالکل الٹ! ان دنوں میرا خیال تھا کہ ادبی لوگوں کو کوئی فرشتوں جیسی نورانی مخلوق لگنا چاہیے۔ اپنی جھجک کے باعث میں اس خوفناک شخص کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکا۔ سب باتیں ندیم نے کیں۔ اس تعارف کا یہ فائدہ ہوا کہ میرے دو تین ہلکے پھلکے مضامین ''شیرازہ'' کے لیے قبول کر لیے گئے اور میرا نام چھاپے میں نمودار ہوا۔

ایک دن ندیم نے مجھے ایک نوجوان مصنف کے بارے میں بتایا، ماسٹر آف آرٹس نوجوان جس نے ''ادب لطیف'' میں اپنی پہلی ایک دو کہانیوں سے ادبی دنیا کو ایک ہی ہلے میں سر کر لیا تھا اور ہر کوئی اس کی باتیں کر رہا تھا۔ اس طرح ہم کرشن چندر سے اس کے داتا دربار کے قریب واقع اخباری دفتر میں جا ملے۔ ایک ہندو بیوہ خاتون نے انگریزی میں ایک ماہوار فیشن میگزین کی اشاعت کا آغاز کیا تھا اور اس کی ادارت کے فرائض غالباً پچہتر روپے ماہوار مشاہرے پر کرشن چندر کو سونپے گئے۔ اس بوٹے سے قد، سرگیں مسکراتی آنکھوں والے خوبصورت نوجوان کو میں نے پسند کیا۔ اس کی گفتگو دھیمی، سلجھی ہوئی اور دلچسپ تھی۔ مگر زیادہ تر باتیں ایک لمبے، دبلے پتلے، مچھلی کی آنکھوں والے آدمی نے کیں، جو لوہے کی تاروں سے جڑا ہوا ایک پرندہ لگتا تھا جس نے کسی طریقے سے ایک میلے سوتی سوٹ کے اندر راستہ پا لیا ہو۔ بعد میں ندیم نے مجھے بتایا کہ یہ حضرت پروفیسر کنھیا لال کپور، مشہور طنز نگار تھے۔ اگر میں چاہتا تو ندیم مجھے دوسری ادبی شخصیتوں سے ملانے لے جاتا۔ وہ بیدی، اشک، دیوندر ستیارتھی اور دوسرے ادیبوں کو جانتا تھا۔ پھر محمد دین تاثیر، عبدالمجید سالک، غلام رسول مہر، مولانا صلاح الدین احمد، پرانی روش کے نثر نگار بھی تھے جن سے اس کو خصوصی نیازمندی تھی لیکن میں ان ادبی ستاروں سے ملنے سے کتراتا رہا۔ میں ادبی لوگوں کی صحبت میں نروس اور سہما سہما رہتا تھا اور اب بھی میرا وہی حال ہے۔

جیسا کہ قرائن سے ظاہر ہے، میں قانون کے پہلے سال میں فیل ہوا۔ میں نے قانون کی کسی کتاب کو اٹھا کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی اور امتحان کے پرچوں میں میں نے بڑے اوٹ پٹانگ، بدمذاق اور غیر متعلق جواب دیے۔ انجینئرنگ کالج میں داخل ہو جانے سے لاہور میں میرا قیام مزید پانچ سال رہا۔ ندیم میسن روڈ پر ایک فلیٹ میں اٹھ آیا تھا اور وہاں ایک سرائے کے کیپر (inn-keeper) کی حیثیت سے رہتا تھا۔ جب بھی میں وہاں جاتا، کوئی ایک درجن کے قریب خوشاب سے آئے ہوئے دیہاتی کمروں کے مختلف کونوں میں چارپائیوں پر مزے سے لیٹے ہوتے۔ اتنی وسیع مہمان داری اس سے کب تک نبھ سکتی تھی! بالآخر اسے یہ فلیٹ چھوڑ دینا پڑا۔ ان سالوں میں ہماری دوستی کی لو کچھ بجھنے لگی اور پرانی چمک دمک اور پہلے والی تابانی ماند پڑ گئی۔ ان پانچ سالوں میں ہم سات آٹھ بار سے زیادہ نہ ملے ہوں گے۔ ندیم کا اس کھچاؤ میں کوئی قصور نہ تھا، ایک عجیب ذہنی بیماری کے بادل مجھ پر چھا رہے تھے — گھنے، کثیف اور دم گھونٹنے والے! میں محسوس کرتا جیسے میں ایک گہرے تاریک گڑھے میں پڑا ہوں اور کبھی سورج کو چمکتے نہیں دیکھ سکوں گا۔

ندیم کے یہ سال ادبی حیثیت سے بہت نتیجہ خیز اور بارآور تھے۔ ہر سال اس کی ایک آدھ کتاب بازار میں آتی تھی۔ اس کے افسانوں کے مجموعے ''بگولے''، ''طلوع و غروب''، اور ''شیرازہ'' میں چھپے ہوئے مزاحیہ مضامین کا انتخاب ''کیسر کیاری'' اسی عرصے میں شائع ہوئے۔ اس کی نظموں اور غزلوں کی کتاب ''جلال و جمال'' اور دیہاتی رومان کے قطعات کے مجموعے ''رم جھم'' نے اس کی شاعری کی عظمت کا سکہ ان لوگوں پر بھی جما دیا جنھیں اس کے جینیئس کے بارے میں کوئی شک تھا۔ اسے اپنے نام کو آدھی درجن کتابوں کی پشت پر چھپا ہوا دیکھ کر مسرت ہوتی ہوگی۔ شاعری اور افسانہ نگاری میں اس کی انوکھی صلاحیتوں نے مولانا صلاح الدین احمد جیسے ناقدوں سے داد وصول کی۔ اس کے قلم نے پنجاب کے دیہات کے رومانس اور حسن کو تابناک، کھنکتے ہوئے الفاظ میں اپنی کتابوں میں مسخر کیا۔ نسبتاً کم عمر میں — چھبیس ستائیس سال کی عمر کو پہنچتے تک — وہ اردو ادب کی دنیا میں اپنی شہرت کو مستقل بنیادوں پر قائم کر چکا تھا اور اگر اس غریب دہقانی نوجوان کے دماغ کو اپنے معاصرین کی تحسین نشیلی شراب کی طرح چڑھی تو یہ قدرتی تھا اور ہم اسے اس پر الزام نہیں دے سکتے۔

مگر یہ سال اس کے لیے انتہائی تنگی اور عسرت کی تلخ کامیوں سے پُر تھے اور فکرِ روزگار نے اس کی پریشان حالی کو کم نہ کیا۔

آنے والے سالوں میں اس کی اپنی روزی کمانے کی جدوجہد، ناشروں اور مدیروں کی نازبرداریاں، مکتبۂ جدید کے چودھری نذیر احمد مرحوم کے

ماہنامے ''ادبِ لطیف'' کی ادارت، آل انڈیا ریڈیو میں دو تین سال کی ملازمت، میاں افتخار الدین کے اخبار ''امروز'' میں ''پنج دریا'' کے قلمی نام سے مزاحیہ کالم نویسی، بعد میں خود اس کرسیِ ادارت پر جمنا جسے چراغ حسن حسرت اور بالیاقت، کم نصیب ادیب نے خصوصیت بخشی تھی، پھر پروگریسو پیپرز کی حکومت کی تحویل میں آنے پر اس سے علاحدگی، وغیرہ— اس سب کچھ کے بارے میں میں ذکر نہیں کروں گا۔ اس پندرہ سال کے عرصے میں ہم کبھی کبھار ہی یکجا ہوئے اور ہماری خط و کتابت عملاً بند رہی۔ ان سالوں کی حقیقی اور دلچسپ داستان ندیم کو خود لکھنی چاہیے اور ممکن ہے وہ کبھی اس کو لکھے گا، جب اسے زندگی کی پگڈنڈی پر دم لینے اور شام کے جھٹپٹے میں طے کیے ہوئے رستے کو مڑ کر دیکھنے کی فرصت میسر ہوگی۔ اور میری خواہش ہے کہ یہ داستان محض واقعات اور اپنے معاصرین کی حکایات کو ذکر میں نہیں لائے گی بلکہ اس کے 'اندر کے آدمی' کی کہانی بھی ہوگی، گو مجھے اس میں شبہ ہے کہ وہ اتنی جرأت، اتنی پُر صداقت بے باکی بروئے کار لا سکے گا جو ایسی خودنوشت کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اسے اپنی پردہ داری کو جھاڑنا اور اس بہروپ کو جسے پہن کر ہم سب دنیا کے کاروباروں میں اپنے ہم نفسوں کے روبرو جاتے ہیں، اتار پھینکنا ہوگا۔ اس کی مرنجاں مرنج طبیعت، وضع داری، اخلاق پرستی، قدیم روش سے فطری لگاؤ— اس کی ظاہری شخصیت کی یہ خوبیاں اس کے اصلی اور سچی بات کہنے کی راہ میں آڑے آئیں گے۔

1962 میں ایک روح فرسا ملازمت کی بیڑیاں پہنے، جن کے لیے میں بالکل نااہل تھا، صحت، امنگ اور ذوقِ زیست میں لٹا ہوا، شدید خود رحمی اور خوف کا شکار، زندگی کے پُر تموج سمندر میں ایک تھکا ہارا تیراک، میں لاہور آیا۔ ندیم سے ملاقاتیں ہونے لگیں، گو آغازِ دوستی کا وہ پہلا والہانہ شعلہ پھر نہ جلا۔ ندیم اپنی معاش کی کٹھن آزمائشوں کے باوجود میرے بارے میں حقیقتاً مشوش تھا۔ وہ ہر ممکن طور پر میرے زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کرتا۔ وہ میری حالت پر افسوس کرتا اور رحم کا اظہار کرتا۔ کوئی آدمی کتنا ہی تباہ و برباد ہو، رحم کھایا جانا پسند نہیں کرتا اور اپنے اس ہمدرد، حوصلہ مند اور خلیق دوست کا میرے لیے ترددّ مجھے بعض اوقات ناگوار گزرتا۔ ایسا رحم، میں سمجھتا ہوں، ایک طرح کی بے رحمی ہے۔

یہاں میرے بھارت بلڈنگ کے دفتر میں ایک دن ندیم میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس نے ایک ادبی مجلہ ''فنون'' نکالنے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کا ڈیکلریشن لے لیا گیا ہے، دفتر کے کمرے کا بندوبست بھی ہو گیا ہے اور اس کا پہلا نمبر دو مہینے کے اندر اندر اشاعت پذیر ہو جائے گا۔ اس نے مجھ سے ''فنون'' کے لیے کچھ لکھنے کی فرمائش کی۔ میں کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ پچھلے پانچ چھ سال اپنی گھونٹ دینے والی مایوسی میں میں نے اردو کی ایک سطر نہیں لکھی تھی— خط تک نہیں۔ اپنے فیک (fake) ہونے کو جانتے ہوئے میں نے مصنف بننے کی خواہش کسی افسوس کے بغیر ترک کر دی تھی۔ لیکن اتنے اچھے ہمدم سے میں کیونکر انکار کرتا، جب یہ اس کی دلی خواہش تھی کہ میں ''فنون'' کے لیے لکھوں۔ میں نے اس سے کچھ لکھنے کا وعدہ کر لیا۔ اس وقت سے میں باقاعدگی سے ''فنون'' میں لکھتا رہا ہوں— تبصرے، مزاحیہ مضمون، کہانیاں— اور اس مجلے کے چند ہی شمارے ایسے ہوں گے جن میں میرا نام نہ چھپا ہو۔ ندیم نے ہمیشہ اپنی تعریف سے میری ہمت بندھائی اور جو چیز بھی میں نے ''فنون'' کے لیے بھجوائی، اس میں شائع ہوئی۔ ان تبصروں اور مضامین کو کوئی دوسرا ایڈیٹر آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا؛ وہ ایک مربیانہ انداز اختیار کرتا اور زبان و بیان کی خامیوں کی طرف میری توجہ دلاتے ہوئے انھیں لوٹا دیتا۔ ''فنون'' میں میں جو چاہتا تھا لکھتا تھا۔ میرے بعض تبصرے ندیم کو اچھے اور متوازن نہیں لگے ہوں گے، تاہم وہ کسی قطع و برید اور ایک لفظ کے حذف کے بغیر چھپے۔ اس سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ وہ اتنا پروڈ نہیں۔ اس طرح میرے ادبی کیریئر کا پھر سے آغاز ہوا۔ میں اپنے فیک ہونے کی دل شکستگی کو بھول گیا۔ اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھنے کی مسرت کافی تھی۔

میری صحت اسی طرح خراب تھی۔ میرے معدے کا نظامِ ہضم درست نہ ہوا۔ مگر ندیم کے ''فنون'' نے مجھے منزل بہ منزل گرنے اور اپنے فطری ملکے (instinct) کی مکمل معدومی سے بچا لیا۔

احمد ندیم قاسمی کی عمر اب چھپن برس ہے، اس کے بال کھچڑی ہو چلے ہیں، مگر اس کی عام تندرستی اچھی ہے۔ وہ اب سمن آباد میں اپنے ایک متواضع اور صاف ستھرے چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ ایک نرم دل باپ، ایک اچھا، خیال رکھنے والا شوہر، ہمیشہ خوش اخلاق، متواضع، ہنس مکھ، کسی قدر محتاط اور مطلقاً راست رو اور بری عادتوں سے پاک۔ آمدنی کے محدود ذرائع کے باوجود اس کا ہاتھ بڑا کھلا ہے اور مجھے کچھ کچھ شک ہے کہ وہ روپے کی قدر و قیمت سے پوری طرح واقف نہیں— وہ روپیہ جس کے نہ ہونے سے وہ ایک وقت پریشان حال رہتا تھا اور اس کے پانچوں حواس ماؤف ہو چلے تھے۔ انگریزی ادب اس نے زیادہ نہیں پڑھا اور کالج میں شیکسپیئر اور نصاب کی کتابیں پڑھنے کے بعد اس نے زیادہ تعداد میں مغربی ناول یا مختصر افسانے نہیں پڑھے ہوں گے۔ موپاساں، ترگنیف، چیخوف کی کہانیاں، ایلیا اہرن

برگ کے دو ایک ناول، شاید کامیو اور سارتر کی اِکا دُکا کتاب ـــ ایک اوریجنل مصنف کے لیے، جیسا کہ وہ ہے، اسے گھاٹا نہیں کہا جا سکتا۔ ولیم شیکسپیئر اور وارث شاہ (میں ان کا ندیم سے موازنہ نہیں کر رہا) ـــ دو بڑے اوریجنل اور حیرت انگیز شاعر ـــ بنیادی طور پر 'پڑھنے والے' نہیں تھے، انھوں نے بہت کم کتابیں چاٹی ہوں گی، مگر ان کا نفسیاتِ انسانی کا خلقی مشاہدہ اور فطری قوتِ بیان ایسی تھی جو بہت کم لوگوں کو قدرت ودیعت کرتی ہے۔ ندیم نے البتہ اردو کے کلاسیکی شعرا کے دیوان ایک طالب علمانہ شغف سے مطالعہ کیے ہیں اور علمِ بحور کے متعلق اتنا کچھ جانتا ہے جتنا کوئی جان سکتا ہے۔ اس کی ''جلال و جمال'' کے بعد کی شاعری میں ایک کلاسیکی کاملیت (perfection) اور گہرائی ہے۔ مگر ذاتی طور پر میں اس کے پہلے دور کی شاعری سے اس کی سادگی، نکھار اور کچی جذباتیت (passion) کی وجہ سے محبت کرتا ہوں۔ اس میں سوندھی سوندھی زمین کی بو باس ہے۔ اس نے اردو زبان میں بڑے اچھے افسانے لکھے ہیں اور مختلف اسالیب (genres) میں اور اگرچہ اس کی پہلی کہانیاں اپنی اصلی اور کچی دیہاتی فضا کے ساتھ قدرے جذباتیت سے رنگی ہیں، اس کی بعد کی متعدد کہانیوں میں فارم کی پرفیکشن اتنی نمایاں ہے کہ وہ واقعی شاہکار کہی جا سکتی ہیں۔ اس کے نکتہ چیں جو اس کو بڑا افسانہ نگار تسلیم نہیں کرتے، اس کے پاسنگ بھی نہیں۔ ویسے ان صاحبان کے نزدیک بے چارے موپاساں اور ماہم بھی نااہل قصہ گو تھے اور کہانی کہنے کے فن میں بالکل اَن گھڑ! ندیم نے شاعری اور افسانہ نگاری کے علاوہ دوسری اصناف میں بھی اپنی لیاقتوں کا استعمال کیا ہے۔ اس نے انگریزی کے گلبرٹ اور سیلواں کے ڈھب پر اردو میں اوپیرا لکھے ہیں، طنزیہ اور مزاحیہ مضامین میں طبع آزمائی کی ہے، ریڈیو، ٹیلی وژن اور فلم اسکرپٹ روانی سے اور قلم برداشتہ تحریر کیے ہیں۔ پھر اس کی روزانہ اخبار میں مزاحیہ کالم نویسی ہے ـــ ہر روز کی پُر تکان مشقت اور تخلیقی فن کار کے لیے ایک بے روح عمل (hack work)! یہ روزانہ کالم اس کی اور اس کے کنبے کی بقا کے لیے ضروری ہیں، اس کا ذریعۂ معاش ہیں، کیونکہ اردو کی ادبی کتابیں بالکل نہیں بکتیں۔ ہوشیار ناشر ایک کتاب کو محکمۂ تعلیم سے منظور کرا کے کتب خانوں میں کھپا دیتا ہے۔ مصنف کی اپنی جلدیں اس کے دوستوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں اور ایک ہزار کا ایڈیشن ختم ہونے میں تین چار سال یا اس سے زیادہ کی مدت لگ جاتی ہے اور اکثر یہ ختم نہیں ہو چکتا۔ منشی پریم چند نے، جو اپنے زمانے میں اردو کے ایک شہرت یافتہ اور مقبول مصنف تھے، اپنی پچھلی عمر میں ایک دفعہ حساب لگایا کہ اپنے درجن سے اوپر ناولوں اور افسانوں کے مجموعوں سے انھوں نے کل بتیس روپے ماہوار سے زیادہ نہیں کمایا تھا۔ (اس زمانے کے بتیس روپے آج کل کے تین سو یا چار سو روپے سمجھ لو۔) کتنا خوش نصیب تھا پریم چند! ان دنوں اردو کا کوئی ادیب بھی اپنی کتابوں سے اتنی آمدنی پیدا کر سکنے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ (میں نسیم حجازیوں، ابنِ صفیوں، رضیہ بٹوں کی بات نہیں کر رہا۔) کالم نگاری یقیناً ندیم کا اصل genre نہیں، جس طور سے یہ چراغ حسن حسرت کا تھا یا عبدالمجید سالک کا، اس لیے اس میں تعجب کی بات نہیں کہ بعض وقت اس کے کالم اپنے نشانے پر ٹھیک بیٹھتے ہیں اور بعض وقت فائر جینڈ بے رخ پڑتا ہے اور آدمی کو کالم نگار کے ساتھ ہمدردی سی ہوتی ہے۔

وہ ادبی دنیا کی اس بلندی پر پہنچ چکا ہے کہ ادبی انجمنوں، کالجوں کی مجالس اور ہر ایک قسم کے مشاعروں کی صدارت کے لیے اس کی کافی مانگ رہتی ہے۔ ایک 'بیبا' انسان ہونے کی وجہ سے وہ انکار نہیں کر سکتا اور اکثر طوعاً و کرہاً اسے یہ اعزاز اپنے سر منڈھنا پڑتا ہے۔ اس کی موجودگی جلسے کی شوبھا بڑھاتی ہے، اس کو امتیاز بخشتی ہے اور جلسے کے مہتمم ایک بڑے ادبی مشیر کو ہتھیا کر فخر و مسرت سے پھولے نہیں سماتے۔ دراصل ایسی صدارتیں اس ملک کی ادبی چہل پہل (literary game) کا ایک جزو ہیں اور شاید ایک مصنف کی نیم نام کے لیے لازمی بھی۔ میرے دوست کے لیے اب یہ گیم پرانی ہو جانے کی وجہ سے کچھ بور ہو چلی ہے اور میں نے بعض موقعوں پر اسے اپنے مداحوں اور مشتاقوں کی کھیپ کو دیکھ کر پگھلا پڑتے اور پھر بڑی وضع داری سے اس تاریخ پر اپنی کسی اور مصروفیت کی اوٹ میں صدارت کی دعوت کو ٹالتے ہوئے پایا ہے۔ ایسے مشکل موقعوں پر اس کا پی اے اختر اسی تاریخ کی کسی اور مصروفیت (engagement) کی یاد دہانی کراتا ہے!

ایک ادبی مجلے کے مدیر کو خالص کاروباری شخص ہونا چاہیے، جو وہ اصلاً نہیں۔ وہ حساب کتاب نہیں رکھ سکتا اور میں اکثر تعجب کرتا ہوں کہ وہ ''فنون'' میں اشاعت کے لیے آنے والے مسودات کو کیونکر سنبھال کر رکھتا ہے۔ وہ کبھی گم نہیں ہوتے۔ ہر ایک مسودہ، نظم ہو یا نثر، وہ خود بغائر نظر پڑھتا ہے، اور ہمیشہ نئی قابلیت کو دریافت کرتا ہے۔ بالکل انجانے، مبتدی لکھنے والوں کے افسانے اس طرح ''فنون'' میں جگہ پاتے ہیں۔ بہت کم مدیروں میں اصلی اور نقلی نگارش اور کندن اور پیتل میں تمیز کرنے کی اہلیت ہوتی ہے اور وہ چیزیں، اکثر اونچے افسروں یا ڈاکٹر نقادوں یا سکہ بند افسانہ نگاروں کی لکھی ہوئی، جو ان کے مجلوں میں لافانی ادبی شاہکاروں کے دھوم دھڑکے کے ساتھ شائع

ہوتی ہیں، ادب سے دور کا واسطہ بھی نہیں رکھتیں — مہمل، بے لطف الفاظ کی صنعت گری! اور ندیم اپنی پروڈاری کے باوجود نئے مصنفوں کی ننگی چیزیں بھی چھاپ دینے سے نہیں ہچکچاتا، اگر ان مصنفوں میں جوہر قابل کی آنچ ہو اور فن کی لگی لگن! یہ میں مانتا ہوں ایک حالیہ اور قدرے حیران کن نمود ہے۔ ایک دو سال پہلے یہ صورت نہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اس نے بعض اچھی اور اعلیٰ پائے کی کہانیوں کو محض اس لیے اپنے رسالے میں نہ چھپنے دیا کہ ان میں جنسی اعضا اور ان کی کارکردگی کا ذکر تھا۔ پھر اس کی یہ عادت بھی تھی (اور وہ اسے ایک مدیر کا استحقاق سمجھتا ہے) کہ وہ اپنے شاعروں اور افسانہ نگاروں کی تحریروں میں ننگے 'تھری لیٹر' الفاظ اور فحش، غیر مہذب خیالات چھانٹ کر ان کی اصلاح کر دیتا تھا۔ تھری لیٹر الفاظ کی جگہ شرافت اور شائستگی کے آئینہ دار الفاظ تحریر میں سج جاتے تھے— اکثر لکھنے والے کے معنی یا خاص تاثر کو جو وہ ان الفاظ سے پیدا کرنا چاہتا تھا، زائل کرتے ہوئے یا ساری تصویر کو ایک نیا رنگ دیتے ہوئے! بہر حال ایسی درستی لکھنے والے پسند نہیں کرتے اور اصلاح دینے والے پر دانت پیستے ہیں۔ کس طرح ندیم کا رویہ اب بدل گیا ہے، یہ میں نہیں جانتا۔ کیا پروڈاری کے بادل اب چھٹ رہے ہیں؟ کیونکہ ''فنون'' کے پچھلے چند شماروں میں چند ایک ایسی چیزیں چھپی ہیں جنھیں دو تین سال پہلے کا ندیم چھاپنے میں جھجک اور رکاوٹ محسوس کرتا۔ ''فنون'' کے لکھنے والے اپنے ایڈیٹر کی اخلاق پرستی کی ڈھیل کو بھانپ کر اب کھل کھیلنے لگے ہیں۔ یہ شاید ان کے لیے اور خود پارسا ایڈیٹر کے لیے اچھا ہے۔ جدید پود، ممنوعات سے سرکشی پر آمادہ، جنس کو اس طرح لیتی ہے جیسے اطفال کے ڈبے کے استعمال کو!

ندیم کی خط و کتابت کافی وسیع تھی (کتنے لمبے اور جذباتی خطوط اس نے منٹو اور دوسرے ادیبوں کو لکھے ہوں گے!) اور اب بھی اتنی کم نہیں۔ اس کی بیشتر مکاتیب نگار غالباً خواتین ہوتی ہیں— ذوقِ ادب و سخن میں مشق کرنے والی عورتیں، نوعمر، ٹین ایج لڑکیاں جن کی ادبی تمنائیں ہیں اور جو ''فنون'' میں اپنا نام دیکھنا چاہتی ہیں۔ وہ ہمیشہ سخن گذاری کے فن میں ان کی کوششوں کو سراہتا ہے، ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مسرت محسوس کرتا ہے۔ اس طرح ''فنون'' نے کئی نئی پود کی شاعرات اور افسانہ نگاروں سے، جن میں اصلی لیاقت کی دمک ہے، پڑھنے والوں کو متعارف کیا ہے۔ ندیم دراصل جدید پود کی جذباتی آزادی اور بے جھجک اظہار سے خوش نہیں— وہ عصمت و عفت مآب کیوں نہیں ہو سکتیں اور اپنی نگارش میں شائستہ اور اچھے الفاظ کیوں نہیں لکھ سکتیں۔ زندگی کی ہر متبرک چیز کے متعلق ان کا بے راہ رو اور گستاخ (flippant) انداز اسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیتا ہے۔ ہائے، دنیا کو کیا ہو رہا ہے؟ یہ اس کی سوچ ہے۔ اس نئی پود کی لکھنے والیوں کو وہ اپنے خطوں میں برادرانہ اور پدرانہ شفقت سے ایک متین لہجے میں نصیحت کرتا ہے کہ وہ یوں اخلاق کی پرانی قدروں کا مذاق نہ اڑائیں اور نیکی و عفت مآبی کی راہ سے نہ بھٹکیں!

کیا میں اپنے دوست کے مرقعے میں رنگ بھرنے میں کامیاب ہوا ہوں؟ کیا اتنے بے ربط، بھنت الفاظ اندر کے آدمی کا کچھ مدھم سا ہیولیٰ قائم کر سکے ہیں؟— شاید نہیں! وہ اسی طرح ایک جزیرہ ہے جیسے میں— اور میں اس جزیرے کو اس کے درختوں کی خوشبو، اس کے چشموں کی مٹھاس، اس کی پہاڑیوں کی دل آویزی سے پہچانتا ہوں۔ کیسی زندگی اس نے گزاری ہے! اس نے بچپن میں قرآن پڑھا ہے اور سعدی کی گلستاں بوستاں، اپنے گاؤں کی چراگاہوں میں گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کبڈی کھیلی ہے، وہ مفلسی اور غربت کی تلخی جانتا ہے، اس نے نظمیں اور کہانیاں لکھی ہیں، وہ کالج میں والی بال کا کپتان رہا ہے، اعصابی مرض نے اسے ایک لمبی مدت تک بے دم رکھا ہے، وہ جیل گیا ہے، اس نے چین دیکھا ہے، اپنے ٹریڈز (Trades) بدلے ہیں، شادی کی ہے اور بچے بچیوں کا باپ بنا ہے۔ جو کچھ پانے کے لیے وہ زندگی کے سفر پر نکلا تھا، اس نے حاصل کیا ہے۔ (واقعی اس نے حاصل کیا ہے؟) زندگی میں بہت سی چیزیں اس نے نہیں کیں— اس نے پتنگ نہیں اڑائی، اونٹ کا سفر نہیں کیا، رابرٹ لوئی اسٹیونسن کو نہیں پڑھا، ہم جنسی کی محبت نہیں کی، کوہ پیمائی نہیں کی، بکرے کی ٹانگوں اور سموں والے یونانی دیوتا کی شہنائی کے دل کش نغموں پر مست نہیں ہوا، نہ ان کی تال پر اوچھے عیاشانہ ناچ ناچے ہیں۔ کنارِ دریا اُسے برہنہ گلعذار ایروس (Eros) پانی میں پاؤں لٹکائے نہیں ملی اور اس کا دل اس کی رنگین ادا پر نہیں لوٹا۔ وہ اپنے بزرگانِ سلف کے بنائے ہوئے سیدھے راستے سے نہیں بھٹکا، وہ اپنے ہتھے سے نہیں اکھڑا اور نشاطِ طبعی کی وادیاں، ہپیوں اور آوارہ مزاج روحوں کی پیاری، اس کے لیے اجنبی رہیں! ... اور کئی دوسری چیزیں!

میں نہیں سمجھتا وہ ان چیزوں کے لیے کبھی پچھتاتا ہے جو اس نے نہیں کیں— اور یہ اچھا ہے۔

یہ ہے وہ بامروّت، انسان کا درد رکھنے والا، خوبصورت آدمی— ایک آدمی، احمد شاہ نامی!

□□□

جمیل الدین عالی

آخری آدمی

احمد ندیم قاسمی پاکستانی دنیائے ادب کے ہمارے دور کے آخری بڑے آدمی تھے۔ صرف اس لیے نہیں کہ ان کی تخلیقی سرگرمیاں کئی اصناف ادب پر محیط تھیں اور ہر تخلیق سے ان کی ایک علاحدہ شان جھلکتی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ ذاتی طور پر بھی ایک بڑے ادیب کی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں انھیں قیام پاکستان سے پہلے بھی ان کی تخلیقی سرگرمیوں کے سبب کسی قدر جانتا تھا لیکن پاکستان بننے کے بعد اور ان کی پہلی شعری تصنیف ''جلال و جمال'' پڑھ کر تو ان سے بہت ہی متاثر ہوا۔ ادب میں نمبر ون ٹو کا سلسلہ نہیں چلتا:

جو ذرہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے

لیکن کسی نہ کسی انداز سے غیر رسمی طور پر ہی سہی، اسی طرح کا تعین مقامات ہماری روایات میں شامل ہو گیا ہے۔ یوں ہمارے نمبر ون جناب فیض احمد فیض تھے اور نمبر ٹو جناب احمد ندیم قاسمی (فیض صاحب کو تو فراق صاحب کے انتقال کے بعد بھارت میں بھی اردو کا نمبر ون تسلیم کیا گیا تھا) پھر فیض صاحب کے بعد اہم ترین وہی نظر آتے رہے، اب جو یہ خبر آئی ہے انتہائی دلی رنج میں ایک خلا شامل ہو گیا ہے۔ ان کے بعد کون؟

قاسمی صاحب انجمن ترقی پسند مصنفین پاکستان کے سکریٹری جنرل بھی رہے مگر بیشتر ادیب تحریک کمزور پڑنے اور حکومت کے زیر عتاب رہنے کے منفی ردعمل سے نہ بچ سکے اور کراچی کے ایک اجلاس میں قاسمی صاحب کو انجمن ختم کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ یہ ایک علاحدہ کہانی ہے اور کئی جرائد و کتب میں آ چکی ہے۔ ترقی پسند تحریک چلتی رہی اور آج بھی خواہ غیر رسمی طور سے چل رہی ہے مگر قاسمی صاحب اس عہدے سے پہلے اور وہ ختم ہو جانے کے بعد بھی فعال رہے اور بہت سے نئے پرانے لکھنے والوں کو فعال رکھا۔ کئی مشاہیر لکھنے والے کسی باقاعدہ شاگردی کے بغیر ارتقا اور شہرت کے لیے خاصی حد تک قاسمی صاحب کی بے غرضانہ سرپرستی کے ممنون ہیں۔ خصوصاً جب سے انھوں نے ''فنون'' شروع کیا، نئے بے نام لکھنے والوں کی کھلی ہمت افزائی کی اور جن کی ہمت افزائی کی ان میں سے بیشتر ہمارے قابل ذکر ادبی اثاثے ثابت ہو چکے ہیں۔ اس طرح کی شخصیت آج ہماری ادبی دنیا میں کمیاب ہی نہیں بالکل نایاب ہے۔

قاسمی صاحب ہر طور سے یعنی کاملاً ایک سیلف میڈ انسان تھے۔ اب بھی روایات کے مطابق تو وہ خاندانی طور پر بھی ایک اہم شخصیت کہے جا سکتے ہیں اور پچاس پچپن برس پہلے وہ کبھی کبھی اپنے نام کے ساتھ ''پیر زادہ'' کا لقب بھی شامل کر لیتے تھے (جو بہت جلد ترک ہو گیا) لیکن اس نسبت سے علاحدہ انھوں نے خالصتاً اپنی محنت، تخلیقی اثاثوں اور عمومی خوش مزاجی سے ایک بڑی سماجی حیثیت بھی بنالی تھی۔ اس سماجی حیثیت میں کوئی اقتصادی پہلو مضمر نہیں ہے۔ ان کی اقتصادی حیثیت سے پورے طور پر واقف بھی نہیں ہوں اتنا جانتا ہوں کہ غالباً ... برس پہلے جب گلڈ نے لاہور میں بہت سے ادیبوں کو جناب حنیف رامے (اس وقت وزیر اعلیٰ پنجاب) کے ہاتھوں سستے داموں زمین الاٹ کرائی تھی تو کچھ رقبہ قاسمی صاحب کو بھی ملا۔ انھیں اس وقت بھی ''فنون'' سے کوئی معقول آمدنی نہیں ہوتی تھی۔ شاید کچھ اپنی زرعی زمینوں سے مل جاتا تھا جو ضلع خوشاب میں واقع تھیں۔ جب وہ مکان بنانے بیٹھے تو مجھ سے اور میری معرفت میر خلیل الرحمٰن مرحوم مدیر ''جنگ'' سے اٹھارہ ہزار روپے قرض لیے (مجھ سے چھ ہزار) میں نے اپنا ذکر اس لیے کیا کہ ان کی ایک اور صفت سامنے آ جائے جس کا مظاہرہ عملی زندگی میں ہم ادیب کم کم کر پاتے ہیں وہ یہ کہ انھوں نے تین چار برس بعد میری طرف سے کسی یاد دہانی کے بغیر جو قرض مجھ سے لیا تھا مجھے واپس کر دیا (اور میرا غالب قیاس ہے کہ میر خلیل الرحمٰن کا قرض بھی ''جنگ'' سے اپنے ماہانہ معاوضے میں سے منہا کراتے رہے)۔

قاسمی صاحب پر ایم فل بھی ہو چکا ہے اور غالباً پی ایچ ڈی بھی۔ ان کی ذات و صفات ایک مضمون تو کیا کتابوں میں بھی نہیں سما سکیں گی۔ ایک دور میں امارات کے دو شہروں ابوظہبی اور دبئی میں ادیبوں کے جشن منائے جا رہے

تھے جس نے 1981 میں ابوظہبی میں مقیم برادرم سید اظہار حیدر اور ان کے ساتھی کارکن برادرم اقبال مہدی اور اراکین بزم شکیل آزاد، اعجاز مرزا، شفیق سلیمی، اختر شیخ، صدیق عربی اور بہت سے مددگاروں کے تعاون سے بڑے پیمانے پر جشن قاسمی کا انتظام کیا۔ اللہ ان تمام کارکنان کو جزا دے۔ (اظہار حیدر تو برسوں ہونے والے غیر متوقع اخراجات کے قرضے ادا کرتے رہے)۔

جب جشن شروع ہوا تو میں یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ وہ واقعی ایک بڑا جشن تھا۔ وہ دوسری مارچ کی ایک شگفتہ رات تھی۔ کئی سو حاضرین و خواتین رات نو بجے سے صبح تین بجے تک ہال میں بیٹھے ان پر منظومات نہیں نثریات سنتے رہے۔ کئی وفود بیرون ملک سے آئے تھے۔ ''قومی زبان'' مئی 1988 سے لے کر میرے تازہ ترین نثری مجموعے ''بس اک گوشۂ بساط'' میں شائع کر دی گئی ہے بلکہ اسی میں ان پر میرا ایک اور مضمون بھی شامل ہے۔ اب کہ اچانک ان کی خبر آئی اور میں ایک طرح جبراً یہ مضمون لکھنے بیٹھا بہت سی باتیں، ان کی بہت سی شخصی صفات یاد آنے لگیں کہاں تک لکھوں۔ لاہور ایک برس سے جانا نہیں ہوا گذشتہ پینتالیس برس میں جب بھی لاہور جانا ہوا خواہ ایک دن کے لیے ہو اولاً حضرت داتا صاحب اگر اتوار نہ ہو تو ان کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا۔ انھیں دیکھ کر ایک سکون سا محسوس ہوتا۔ ہمیشہ بات چیت کا موقع تو نہیں نکلتا تھا مگر ان سے دو چار کلمات کا تبادلہ ہی ادب پر انسانیت پر سے کم ہوتا ہوا اعتماد بڑھا دیتا۔

یا اللہ اب میں لاہور کے کس دربار میں جاؤں گا بس اکیلا داتا دربار ہی رہ گیا ہے مگر وہ اور شعبہ ہے وہاں اکثر اپنے آپ پر شرمندگی بھی ہوتی ہے۔ قاسمی صاحب دوسرا شعبہ تھے آج اس شعبے کا دوسرا نظر نہیں آ رہا، کاش نظر آ جائے۔

(بہ شکریہ روزنامہ ''آبشار'' کولکاتہ، 16 جولائی 2006)

□□□

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جو اب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اول، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت: -/36 روپے

جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت: -/40 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یورپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ شعر و ادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و موانست ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 740، قیمت -/145 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔
تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

رفعت سروش

احمد ندیم قاسمی

دو روز قبل یہ خبر پڑھ کر آنکھیں بھیگ گئیں کہ اس نسل کا آخری شاعر بھی اس دنیا سے اٹھ گیا جس نسل کے شعرا کا کلام پڑھ کر شعر کہنے کا سلیقہ آیا تھا اور حوصلہ بڑھا تھا۔ اس شاعر کا نام ہے احمد ندیم قاسمی۔ جب میں نے ہوش سنبھالا اور شعر گوئی کی طرف مائل ہوا یہ 1938 کی بات ہے۔ اس زمانے میں اقبال کے کلام کے علاوہ میرے مطالعے میں جوش کے مجموعے ''شعلہ و شبنم'' اور ''حرف و حکایت'' اور احسان دانش کا مجموعۂ کلام ''تفسیر فطرت'' نگینہ جیسی جگہ میں جدید اور ترقی پسند ادب کی رسائی کے نمونے برابر رہے۔ ان دنوں دو شاعروں کے قطعات نے بھی ذہن کو مسخر کر لیا تھا۔ احمد ندیم قاسمی اور اختر انصاری۔ ان دونوں کے قطعات کے مجموعوں کے نام تھے ''رم جھم'' اور ''آبگینے''۔ یہ تاثر اب تک ذہن میں ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے قطعات افسانوی رنگ لیے ہوئے ہوتے تھے اور اختر انصاری کے یہاں واردات قلبی کی عکاسی تھی۔ مثلاً ان کا ایک قطعہ تھا۔

یہ آرزوئیں، یہ جوشِ الم، یہ سیل نشاط
یہ دل کہ ہے تپشِ حسن و عشق کا سوتا
ستم ہے نہیں جاتے بھری جوانی کے
میں ابتدائے جوانی میں مر گیا ہوتا

اور احمد ندیم قاسمی کے دو قطعے یاد آئے ۔

گاؤں کے گھورے پہ مرغے نے اکڑ کر دی اذاں
مرغیاں ڈربے میں کڑکڑائیں کہ جانے کیا ہوا
سب کی سب دوڑیں مگر چل دیں یہ منظر دیکھ کر
اک نئی مرغی کے پہلو میں ہے وہ لپٹا ہوا

(آج محسوس کرتا ہوں کہ یہ کیسا بے مثال تمثیلی قطعہ ہے)

دوسرا قطعہ ہے:

باغ سے کچھ پھول توڑے اور بنایا ایک ہار
آپ کے آنے کا جب دل کو یقیں ہونے لگا
وائے ناکامی نہ آئے آپ اور میں بد نصیب
ہار کو اپنے گلے میں ڈال کر رونے لگا

پورا افسانہ ہے اس قطعے میں۔

ان کے افسانے بھی پڑھے جن میں دیہات کی زندگی کا عکس نظر آتا تھا۔ وقت گزرا اور نگینہ سے دہلی دو سال قیام کر کے جب بمبئی پہنچا تو ترقی پسند تحریک سے نہ صرف آشنائی ہوئی بلکہ میں اس تحریک کا ایک رکن بن گیا اور تب معلوم ہوا کہ ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے والوں میں ایک اہم نام احمد ندیم قاسمی کا بھی ہے اور اردو افسانے کے عناصر اربعہ یعنی کرشن چندر، بیدی، عصمت اور منٹو کے بعد جو پانچواں نام تھا وہ احمد ندیم قاسمی ہی کا تھا۔ اس زمانے میں وہ بہت کہتے تھے اور بہت چھپتے تھے۔ لاہور ان کا مرکز تھا۔ ان کی شخصیت فیض، راشد اور میرا جی سے الگ تھی۔ پھر وہیں سے ساحر لدھیانوی ابھر کر آئے اور دیکھتے دیکھتے افقِ ادب پر چھا گئے۔ 1946 میں لکھنؤ سے خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور (دونوں بہنیں) بھی آ گئیں، کچھ دن بمبئی رہیں۔ ان دونوں کو احمد ندیم قاسمی سے بہنوں کی سی قربت تھی۔ ہاجرہ مسرور ساحر لدھیانوی کی ناپختہ محبت کا زخم کھا کر عازم لاہور ہوئیں۔ اور کچھ دن بعد اس دور کے رسائل میں خط چھپتے تھے، ہجو بہن (یعنی ہاجرہ مسرور) اور ندو بھیا (یعنی احمد ندیم قاسمی)۔ احمد ندیم قاسمی نے ان دونوں بہنوں کو بہت سہارا دیا۔ خدیجہ مستور کی تو شادی کرا دی اپنے ایک بھانجے بابر سے اور ہاجرہ مسرور کی شادی اس کے بعد ہوئی مہوال کے احمد علی سے جو ''ڈان'' کے ایڈیٹر تھے۔

ترقی پسند تحریک بڑے نشیب و فراز سے گزر رہی تھی اور آزادی کے بعد وہ دور بھی آیا جب علی سردار جعفری نے ''نیا ادب'' ماہنامہ میں ''دار و رسن'' کا سلسلہ ترویج کیا جس میں ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے ''اعمال ناموں'' کا حساب کیا جانے لگا اور اکثر معتوب ٹھہرے۔ یہ بحث بہت طویل ہے۔ صرف اتنا عرض کر دینا ہے کہ سردار جعفری کے منصفانہ قلم نے خواجہ احمد عباس کو ترقی پسندوں کی صفوں سے خارج کر دیا۔ فیض پر مبہم ہونے کا الزام لگایا کیونکہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر'' (فیض) کس پارٹی کا ردِ عمل ہے۔ سردار کھرا اور صاف بیان چاہتے تھے۔ بہر حال اس ''ٹرائل'' میں پاکستان کے احمد ندیم قاسمی شاید واحد شاعر تھے جن کو ترقی پسند مانا گیا۔ بڑا برا وقت تھا ''سمجھ دار ترقی پسندوں'' کے لیے۔ یہ قیامت کی رات بھی گزری اور 1960 کے بعد تو ادب کا منظر نامہ ہی بدلنے لگا اور ادب کی ناقدانہ جہات ٹھیک کی جانے لگیں۔

تاریخ ادب شاہد ہے کہ احمد ندیم قاسمی اپنی سنجیدگی اور تخلیقی صلاحیتوں کے ساتھ ایوانِ ادب میں ایک پُر وقار اور غیر متنازعہ مقام پر متمکن رہے۔ وہ ان فن کاروں اور شاعروں کے ساتھ کالم نگاری بھی کرتے رہے کیونکہ پاکستان میں اردو اخباروں میں کالم نگاری نے ایک منفعت بخش صنفِ تحریر کی حیثیت حاصل کر لی اور اک باوقار رسالہ ''فنون'' بھی نکالتے رہے۔ انھوں نے خاموش طریقے سے پاکستان کی کئی نسلوں کی تربیت کی اور ان کا نام ہمیشہ عزت سے لیا گیا۔ وہ نظم وغزل دونوں اصنافِ سخن میں قدرت رکھتے تھے ایک زمانے میں تخلیقِ آدم اور زمین کے تعلق سے بہت سی نظمیں کہی جاتی تھیں۔ جوش کی ایک طویل نظم تھی۔ راقم الحروف نے بھی ''زمین آدم'' کے عنوان سے ایک ریڈیائی ڈراما لکھا تھا۔ وہ ڈراما میں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی ایک میٹنگ میں سنایا۔ اس پر کافی گفتگو ہوئی۔ ظ۔ انصاری نے تو یہاں تک کہا کہ اس میں کچھ اشیا ضرب المثل بن جانے کے لائق ہیں۔ سردار جعفری نے نظم کو طویل بتاتے ہوئے کہا کہ احمد ندیم قاسمی نے ایک ہی شعر میں اس موضوع کو سمیٹ دیا ہے۔

یہ زمیں، یہ خلا کی رقاصہ
آدم نو کے انتظار میں ہے

میں نے محسوس کیا کہ احمد ندیم قاسمی نے زمین کو خلا کی رقاصہ کہہ کر واقعی شعری کارنامہ انجام دیا ہے۔ میرے دل میں تو بچپن سے ہی احمد ندیم قاسمی کا احترام تھا اس میں اور اضافہ ہوا۔

تقسیم کے بعد دونوں ملکوں میں جو دوری ہوگئی ہے اس نے باوجود ثقافتی ہم آہنگی کے دونوں ملکوں کے ادیبوں اور شاعروں کو دور دور کر دیا۔ میں چونکہ آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھا اور وقتِ ضرورت 1965 اور 1971 میں اپنے ملک کا نقطۂ نظر واضح کرنے اور ریڈیو پر براڈکاسٹ کرنے کے باعث میرا پاکستان جانا مشکل ہی تھا مگر میں 1982 میں اپنے دوست محمد حسن عسکری (ابن سعید مرحوم، اس وقت کے پاکستان کے پریس منسٹر) کی عنایت سے ایک ماہ کے ویزا پر پاکستان گیا اور صرف تین دن لاہور ٹھہرا مگر وہ تین دن بہت یادگار دن تھے۔ 5 نومبر 1982 کی شام کو لاہور کے مشہور ہوٹل 786 کے کشادہ ہال میں ایک جلسے کا انعقاد کیا گیا جس میں اس وقت کے سب قابلِ ذکر شاعر اور ادیب جلسہ گاہ میں موجود تھے۔ قتیل شفائی، عطاء الحق قاسمی، منیر نیازی، سعادت سعید اور دیگر حضرات۔ میرے لیے خوشی اور فخر کی بات یہ تھی کہ جو جلسہ مجھ ناچیز کی عزت افزائی کے لیے منعقد کیا گیا تھا اس کی صدارت وہ شخص کر رہا تھا جس کا کلام میں بچپن سے پڑھتا آیا تھا، یعنی احمد ندیم قاسمی۔ میں اس تاثر کو آج بھی اپنے ذہن میں زندہ محسوس کرتا ہوں جب احمد ندیم قاسمی نے میرے بارے میں تعریفی کلمات کہے۔ ان کی نظر میں ترقی پسند تحریک کے حوالے سے میری شعری خدمات تھیں جس کا اظہار انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کیا اور مجھے تو یہ نادر موقع نصیب ہوا تھا کہ میں احمد ندیم قاسمی کی خدمت میں وہ تاثرات پیش کرسکوں جو میرے ذہن میں ان کے لیے بچپن سے موجزن تھے۔ احمد ندیم قاسمی ایک پُر وقار شخصیت کے مالک تھے۔ موزوں قد و قامت قمیص اور پتلون میں ملبوس (جب کہ وہاں اکثر ادیبوں نے عوامی لباس زیب تن کیا ہوا تھا) بیضاوی چہرہ، آنکھوں پر عینک، آواز میں ٹھہراؤ اور لہجے میں یقین و اعتماد۔ 5 نومبر کی وہ شام مجھے ہمیشہ یاد رہے گی جب میں اپنے پسندیدہ شاعر احمد ندیم قاسمی سے ملا، ان کے ساتھ گفتگو کی اور چائے پی۔ اس کے بعد مجھے قاسمی صاحب سے ملاقات کا موقع نہیں ملا۔ جن دنوں چند سال پیشتر وہ دہلی آئے تھے میں بہ عارضۂ کینسر اسپتال میں داخل تھا۔ اور اب ان کے انتقال کی خبر پڑھ کر بے اختیار آنکھیں نم ہوگئیں ؎

موت اپنے ساتھ لے جائے گی تو کتنے جنازے
بزمِ اردو میں ہوا جاتا ہے اب تو ہُو کا عالم

وہ اپنی نسل کے آخری شاعر تھے۔ شاید اب ان سے بزرگ کوئی مشہور ادیب یا شاعر پاکستان اور ہندوستان میں نہیں ہے۔ ایک زریں دور کا خاتمہ ہو گیا۔ ایک ہمہ جہت اور ہمہ رنگ شخصیت سے اردو زبان ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی۔

احمد ندیم قاسمی ایک ادبی تحریک تھے، ایک ادارہ تھے، ایک مکتبِ فکر تھے اور ان پر کام کرنے کے لیے ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جو ان کی شخصیت اور کے فن کے مختلف پہلوؤں کو مجتمع کرے۔ وہ گزشتہ 75 سال کی ادبی تاریخ کے رازداں تھے اور رومانی تحریک سے لے کر مابعد جدیدیت تک ان کے ادب میں سروکار کا مطالعہ اہم ہے اور دلچسپ بھی۔ ان کے ہاں انتہا پسندی نہیں تھی، ایک اعتدال تھا جو ان کی زندگی اور ادب دونوں میں آخر وقت تک موجود رہا۔ ان کے آخری دور کی ایک غزل واضح کرتی ہے کہ وہ عمر بھر کن اعلیٰ اقدار کی پاسداری کرتے رہے ؎

میں استعمالِ سچ کا نسخۂ اکسیر کرتا ہوں
میں بے توقیر انسانوں کی بھی توقیر کرتا ہوں
سدا دیوارِ نفرت پر سجا رکھتا ہوں تیروں کو
میں اپنے دشمنوں کی اس طرح تحقیر کرتا ہوں
میں مٹی سے بنا ہوں، لیکن اونچی ہے انا میری

میں ساتوں آسمانوں پر زمیں تحریر کرتا ہوں
میں فانی ہی سہی لیکن مرا اسلوب تو دیکھو
میں اپنی زندگی میں روز و شب تسخیر کرتا ہوں
مرا اک ایک لمحہ اک صدی ہے اک زمانہ ہے
میں اپنی شاعری میں وقت کو زنجیر کرتا ہوں

(کتاب نما، ستمبر 2005)

سچائی جس کا مسلک، مٹے گزرے انسانوں سے بھی جسے محبت اور زمین کی عظمت کا پرچم آسمانوں پر بھی بلند کرنے کا حوصلہ رکھنے والا شخص واقعی یہ کہنے کا حق رکھتا ہے "مرا اک ایک لمحہ اک صدی ہے، اک زمانہ ہے" وہ موت کے منظر سے بھی زندگی کا لطف کشید کرتا ہے اور انسان کو ڈوب کر پھر ابھرنے والا سورج تصور کرتا ہے ۔

غروب مہر جہاں تاب کا جلال تو دیکھ
تری بھی عمر اگر منزلِ زوال میں ہے

رجائیت کی ایسی تصویر جس شاعر کے یہاں ہو اس کا کلام کیسے زوال پذیر ہو سکتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی کی غزلوں کے کچھ اور اشعار جو ان کی فکر کی تابانی اور تغزل کی لطافت کے حامل ہیں ۔

مجھے دکھ یہ ہے کہ بہار میں بھی طیور بے پر و بال ہیں
مرے ہم سفر نہ ملول ہوں یہ ملال میرے ملال ہیں
مری بے کلی سے خفا نہ ہو، مری جستجو کا بھی بھرم رکھو
تجھے اک جواب وبال ہے، مرے لب پہ لاکھ سوال ہیں

وہ کتنی سادگی سے اپنی جاں گنوا بیٹھے
مکان گرنے سے پہلے چھتوں پہ جا بیٹھے
عجب تھے ہم بھی کہ سیلاب کے اترتے ہی
کنارِ آبِ رواں بستیاں بسا بیٹھے

بس ایک کنج قفس تک نہ آ سکی، ورنہ
صبا چلی تو چمن میں کہاں کہاں نہ گئی
دیار عشق کھنڈر، اور دشت دل سنسان
مگر ندیم کی رنگینیِ بیاں نہ گئی

احمد ندیم قاسمی غزل اور نظم دونوں اصناف سخن میں مہارت رکھتے تھے۔ ان کے یہاں خیال کی گہرائی تھی۔ سوچ واضح تھی۔ انسان کی عظمت کے وہ قائل تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ جوان ہوئے تھے اس لیے ان کے یہاں زندگی کے مسائل سے سروکار، بہتر زندگی کی جدو جہد اور عصری تہذیب کے لیے ناقدانہ رویہ ہے۔ نہایت شائستگی اور شاعرانہ بصیرت کے ساتھ ان کی ایک نظم "ستارہ شناس" کا ایک بند میں اپنی بات کی تائید میں پیش کر رہا ہوں:

اک ایسے دور میں پیدا ہوئی ہے پود اپنی
کہ ایک پل میں زمانے گزرتے دیکھے ہیں
فضا کے دام میں الجھے ہوئے غریب انساں
نظام شمس پہ یلغار کرتے دیکھے ہیں
بصیرتوں پہ رہی برق بارجن کی چمک
وہ آفتاب خلاؤں میں مرتے دیکھے ہیں
جنھیں فقط دلِ آدم کی تھی قضا محبوب
وہ زخم سینۂ مہ پر بکھرتے دیکھے ہیں
جو نصف شب کو سنی ہے صدائے پائے سحر
تو دوپہر کو ستارے ابھرتے دیکھے ہیں

اور یہ نظم سائنسی ایجادات اور کائنات پر انسان کی فتوحات کے تصور کو اجاگر کرتی ہوئی شعر پر ختم ہوتی ہے ۔

ہیں لمحہ لمحہ کی زد میں صدی صدی کے اصول
کہ ہو رہی ہے نئی صبح آگہی بیدار

(افکار، منظومات نمبر ص، 44)

احمد ندیم قاسمی نہ صرف یہ کہ افسانہ نگار تھے بلکہ ایک دانشور اور ناقد بھی تھے۔ اردو افسانہ گذشتہ پچاس سال میں بہت زیر و بم سے گزرا ہے اور اس نے بمشکل تمام افسانہ پن کو کھو کر اسے دوبارہ پایا ہے۔ اس سلسلے میں احمد ندیم قاسمی کی رائے چراغ ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے اور اس اقتباس کے ساتھ یہ تاثراتی تحریر اختتام پذیر ہوتی ہے:

"افسانے میں افسانے کا عنصر ہر قیمت پر باقی رہنا چاہیے۔ افسانے کی یہ افسانویت ایک منضبط پلاٹ کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے، کردار نگاری کی صورت میں بھی، ماحول نگاری کی صورت میں بھی۔ لیکن افسانے میں سے افسانہ غائب ہو گیا تو اس صنف کو افسانے کی بجائے کوئی اور نام دینا پڑے گا۔"

(شاعر، ہم عصر اردو ادب نمبر ص، 578)

204, Saba Apartment
D-3, Sector - 44
Noida - U.P.

□□□

مجتبیٰ حسین

احمد ندیم قاسمی ــــ ایک خراج عقیدت

صاحبو! اب تو یہ حال ہوگیا ہے کہ اتوار کی چھٹی کے بعد جوں ہی نیا ہفتہ شروع ہوتا ہے ہم رات کو سونے سے پہلے گڑگڑا، گڑگڑا کر خدائے بزرگ و برتر سے دعائیں مانگتے ہیں کہ اے پاک پروردگار کم از کم اس ہفتے میں اردو کے کسی ادیب یا شاعر کو، چاہے وہ کتنا ہی قادرالکلام، معمر، مستند، نیک اور پاکباز کیوں نہ ہو، عالم بالا میں مشاعرہ وغیرہ پڑھنے کی غرض سے اپنے ہاں طلب نہ کر۔ انھیں اسی دنیا میں اتنی داد، پذیرائی، شہرت (تھوڑا سا واجبی معاوضہ بھی ساتھ میں) دلوادے کہ ان میں جینے کی نئی امنگ پیدا ہو اور وہ ہم جیسے سخن نافہموں اور کندۂ ناتراشوں کے درمیان ہنسی خوشی کچھ دن اور جی لیں اور اپنے کلام بلاغت و بلوغت نظام سے ہمیں محظوظ، مستفیض اور مسرور وغیرہ فرمائیں۔ تیرے حکم کے بغیر یہاں پتا بھی نہیں ہلتا۔ جو بھی یہاں آتا ہے وہ ایک دن واپس بھی چلا جاتا ہے لیکن ان دنوں اردو کے ادیب و شاعر (بشمول خود اردو زبان کے) اس دنیا سے نہ صرف جلدی بلکہ جوق در جوق واپس جا رہے ہیں۔ اے پروردگار اپنے کرم سے ان کے یہاں سے واپس جانے کے سلسلے کو فی الحال روک دے تاکہ کچھ دن اور اس دنیا میں گلشن کا کاروبار وغیرہ چلتا رہے اور اردو کے شاعر و ادیب حسب معمول خواب غفلت میں جاگتے رہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ لوگ قناعت اور توکل کے اصولوں پر عمل کرنے کے قائل ہیں۔ بھلے ہی انھیں روٹی، کپڑا اور مکان نہ ملے لیکن ان کے کلام اور تخلیقات پر ذرا سی بھی داد، سبحان اللہ، ماشاء اللہ اور جزاک اللہ وغیرہ مل جائے تو برسوں زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، چاہے سوکھ کر کانٹا ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ ان کی سخت جانی اور جس زبان میں یہ لکھتے ہیں خود اس کی سخت جانی دونوں ایک دوسرے کے ہم پلہ اور ہم سر ہیں۔ اے پروردگار ہماری ایک شخصی اور خصوصی عرضداشت یہ ہے کہ بار بار ہم سے تعزیتی کالم لکھوا کر ہمارے صبرو تحمل اور قوت برداشت کو آزمائش میں مبتلا نہ کر۔ اگر ہم اسی رفتار سے لوگوں کے گزر جانے پر تعزیتی کالم لکھتے رہے تو خود ہمارا کیا ہوگا۔ ہم بھی تو آخر کو انسان ہیں اور ایک دن ہمیں بھی گزر جاتا ہے۔ اگر خدانخواستہ ہمارے سارے احباب اور پیشرو گزر جائیں تو ہمارے بارے میں کون تعزیتی کالم وغیرہ لکھے گا۔ کون اس خلا کی نشاندہی کرے گا جو ہمارے جانے سے ادب وغیرہ میں پیدا ہوگا۔ کون ہماری لحد پر شبنم افشانی وغیرہ کرائے گا۔ ایسے ہی اندیشہ ہائے دور دراز کے بارے میں سوچتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آجاتا ہے۔ بعض ستم ظریف تو ہمارا شمار ادیبوں میں نہیں بلکہ ان گورکنوں اور غسالوں وغیرہ میں کرنے لگے ہیں جو انسانوں کو زمین کے اوپر نہیں بلکہ زمین کے نیچے آباد دیکھنا چاہتے ہیں۔ یا خدا ہمیں اس پرآشوب دور سے نجات دلا۔

صاحبو! آج ہم جس ہستی کے بارے میں تعزیتی کالم لکھ رہے ہیں اس کا گزر جانا سارے اردو ادب کا ایک المناک سانحہ ہے اور یہ ایک ایسا نقصان بھی ہے جو واقعی ناقابل تلافی ہے۔ احمد ندیم قاسمی معاصر اردو ادب کے بزرگ ترین شاعر، ادیب اور صحافی تھے۔ 70 برس پہلے انھوں نے غیر منقسم ہندوستان میں جب اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا تھا تو وہ دور اردو شعر و ادب کا زریں دور تھا اور سارے ملک میں اردو کا بول بالا اور غلغلہ تھا۔ ان کے تخلیقی سفر کے آغاز کے ساتھ ہی ہم نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں اور جب ان کے تخلیقی سفر کی عمر یعنی خود ہماری عمر دس گیارہ برس کی ہوگئی اور اردو شعر وادب میں ہماری دلچسپی بڑھی تو جن تین ادیبوں کی کتابیں ہم نے پہلے پہل پڑھیں ان میں کرشن چندر، سعادت حسن منٹو اور احمد ندیم قاسمی شامل تھے۔ یہ 1944 یا 1945 کی بات ہے۔ اپنی کمسنی کے باعث ہوسکتا ہے منٹو کے افسانوں کی تہہ داریوں کو ہم سمجھ نہ پائے ہوں لیکن احمد ندیم قاسمی اور کرشن چندر کی تحریروں کے ہم عاشق ہوگئے۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے اپنے تخلیقی سفر کے آغاز کے ساتھ ہی جس اعلیٰ درجہ کا ادب تخلیق کیا تھا اس درجہ کے اعلیٰ معیار کو بعد میں ستر برس تک برقرار بھی رکھا۔ یوں لگتا ہے جیسے قدرت نے انھیں ابتدا ہی سے ایک بزرگ، پختہ کار اور تجربہ کار ادیب کے روپ میں پیدا کیا تھا۔ اس وقت ہمیں ایک بات اور یاد آئی۔ سنا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے بال جوانی میں ہی سفید ہونے لگے تھے۔ شروع میں تو انھوں نے اپنے بالوں میں سفیدی کو بڑھنے کا موقع عطا کیا (تاکہ ان کی بزرگی اور پختہ کاری مزید عیاں ہو) لیکن جب ان کے احباب نے عین عالم شباب میں ان کے بالوں کی سفیدی پر اعتراض کیا تو بعض احباب کے مشورے سے انھوں نے اپنے

بالوں میں خضاب لگانا شروع کر دیا۔ یوں وہ پھر سے جوان رعنا بن گئے۔ ایک دن کسی محفل میں ان کے ایک دوست نے احمد ندیم قاسمی سے کسی صاحب کا تعارف کرانا چاہا تو ان صاحب نے تعارف کے سلسلے کو رکواتے ہوئے کہا ''حضور! آپ ان سے میرا کیا تعارف کرائیں گے۔ میں تو ان کو اس وقت سے جانتا ہوں جب ان کے بال سفید ہوا کرتے تھے۔'' یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ احمد ندیم قاسمی نوے برس تک نہ صرف جوان اور تنومند رہے بلکہ تخلیقی اعتبار سے آخر وقت تک سرگرم عمل بھی رہے۔ ان کا انتقال 10 جولائی 2006 کو ہوا اور ان کے انتقال سے ایک دن پہلے کے روزنامہ ''جنگ'' میں ان کا لکھا ہوا کالم ''رواں دواں'' بھی شائع ہوا۔ جسے انھوں نے 6 جولائی کو لکھا تھا۔ ایسی کارآمد، فعال، سرگرم اور بھرپور زندگی کس فنکار اور کس بزرگ کو نصیب ہوتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے شمال مغربی پنجاب کے ضلع خوشاب کے گاؤں انگہ میں 20 نومبر 1916 کو آنکھیں کھولیں۔ انھوں نے بہاولپور کے کالج سے بی اے کیا۔ کچھ عرصہ تک محکمہ ایکسائز میں اسسٹنٹ انسپکٹر کے طور پر کام کیا۔ اپنے ادبی ذوق اور کیریئر کی خاطر وہ لاہور چلے گئے جہاں ان کی ملاقات لاہور کی معروف ادبی شخصیت غلام صوفی تبسم سے ہوئی۔ ان دنوں لاہور اردو شعر و ادب کا گہوارہ تھا اور اردو ادب کی کئی اہم اور مستند شخصیتیں یہاں فروکش تھیں۔ یہیں سے احمد ندیم قاسمی نے اردو شعر و ادب اور صحافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ انھوں نے لاہور کے متعدد ادبی رسالوں کی ادارت کی۔ 1943 سے 1945 تک وہ ''ادب لطیف'' کے مدیر رہے۔ 1947 میں وہ مشہور ادبی رسالہ ''سویرا'' کے کچھ شماروں کے مدیر بھی رہے۔ جب محمد طفیل نے ''نقوش'' کا اجرا کیا تو احمد ندیم قاسمی اس کے مدیر مقرر ہوئے لیکن بعد میں وہ ''نقوش'' سے الگ ہو گئے اور 1963 میں اپنا رسالہ ''فنون'' جاری کیا جو آج بھی شائع ہوتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ جہاں وہ بہترین افسانہ نگار تھے وہیں وہ اعلیٰ پائے کے شاعر ہونے کے علاوہ بے مثال مزاح نگار، نقاد، صحافی اور مدیر بھی تھے۔ پاکستان کے ادبی حلقوں میں وہ بے حد احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے البتہ نقاد، شاعر اور انشائیہ نگار وزیر آغا مدیر ''اوراق'' سے ان کی معاصرانہ چشمک کا بڑا چرچا رہا کرتا تھا۔ لیکن یہ معاصرانہ چشمک زیادہ تر یک طرفہ ہوا کرتی تھی کیونکہ احمد ندیم قاسمی خود اس میں شامل نہیں رہتے تھے۔ تاہم ان دونوں کے مداحوں اور معتقدین کے درمیان ''موازنۂ انیس و دبیر'' ہمیشہ زور و شور سے جاری رہا۔ احمد ندیم قاسمی بنیادی طور پر نہایت شریف، باظرف اور شائستہ انسان تھے۔ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔ شروع ہی سے وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے۔ 1948 میں حیدرآباد میں پولیس ایکشن کے بعد ابراہیم جلیس جب ہجرت کر کے لاہور آ گئے تو احمد ندیم قاسمی، ابن انشا اور حمید اختر نے ان کی بڑی پذیرائی کی جس کا حال انھوں نے اپنے رپورتاژ ''دو ملک ایک کہانی'' میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ حیدرآبادی ادیبوں سلیمان اریب، جیلانی بانو، اقبال متین، شاذ تمکنت، عزیز قیسی، وحید اختر، مغنی تبسم، عوض سعید، آمنہ ابوالحسن کو انھوں نے اپنے رسالوں میں ہمیشہ بڑے اہتمام سے چھاپا۔ ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اعلیٰ پائے کے فکاہی کالم نگار بھی تھے۔ 1962 میں جب ہم نے کالم نگاری شروع کی تو وہ روزنامہ ''امروز'' میں عنقا کے قلمی نام سے فکاہیہ کالم لکھا کرتے تھے۔ ان کے طنز میں جو گہرائی اور مزاح میں جو شائستگی ہوتی تھی وہ لاجواب تھی۔ یوں وہ ہمارے پسندیدہ کالم نگار بن گئے۔ برسوں ہم نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کے کالم پڑھے یہاں تک کہ ان کی کالم نگاری ہمارے مزاج اور شعور کا حصہ بن گئی۔ احمد ندیم قاسمی نے قلم کو ذریعۂ معاش بنایا اور قلم کی حرمت کو برقرار رکھتے ہوئے نہایت خوددار اور با عزت زندگی گزاری۔

ہمیں اپنے محبوب ادیب سے زندگی میں صرف دو مرتبہ ملنے کا موقع ملا۔ 1988 میں علی صدیقی کی دعوت پر عالمی اردو کانفرنس میں شرکت کے لیے وہ دہلی آئے تھے۔ ہمارے دوست حسن چشتی بھی اس کانفرنس میں شکاگو سے آئے تھے۔ دونوں کا قیام ہوٹل کنشک میں تھا۔ احمد ندیم قاسمی بڑی محبت سے ملے۔ ہمارا حال چال پوچھا مگر ان سے تفصیلی ملاقات اس لیے نہ ہو سکی کہ وہ صرف دو دنوں کے لیے دہلی آئے تھے۔ البتہ 1989 میں ہم کراچی گئے تو ہمارے دو عزیز دوستوں عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد نے، جو احمد ندیم قاسمی کے گہرے عقیدت مند بھی ہیں، ہمیں لاہور آنے کی دعوت دی۔ لاہور اور اسلام آباد میں ہم نے ایک ہفتہ گزارا۔ عطاء الحق قاسمی نے لاہور کے ہوٹل شیزان میں ہمارے لیے ایک محفل رکھی تو اس کی صدارت احمد ندیم قاسمی نے ہی کی جس میں لاہور کے کم و بیش سارے ہی سربرآوردہ ادیبوں نے شرکت کی۔ احمد ندیم قاسمی نے اس محفل میں ازراہ عنایت ہمارے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا وہ ہمارے لیے ایک اعزاز سے کم نہ تھا۔ دوسرے دن انھوں نے ادارہ مجلس ترقی ادب کے دفتر میں بھی ہمیں مدعو کیا جس کے وہ ان دنوں ڈائرکٹر تھے۔ کیسے بتائیں کہ اپنے محبوب ادیب سے مل کر ہمیں کتنی خوشی ہوئی تھی۔ 1997 میں دوبئی سے واپس ہوتے وقت ہمیں آٹھ گھنٹوں کے لیے

ٹرانزٹ مسافر کے طور پر لاہور کے ایک ہوٹل میں ٹھہرنے کا موقع ملا تھا۔ احمد ندیم قاسمی سے صرف فون پر بات ہو سکی۔ البتہ امجد اسلام امجد ہم سے ملنے کے لیے ہوٹل پر آئے تو اپنے ساتھ اس ڈاکیومنٹری فلم کا کیسٹ بھی لیتے آئے جسے انھوں نے احمد ندیم قاسمی کی زندگی اور ان کے فن پر ان دنوں بنائی تھی۔ دہلی میں احمد ندیم قاسمی کے کئی چاہنے والوں نے یہ فلم دیکھی اور یہ ہمارے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے بھرپور زندگی جی اور ساری دنیا میں اپنے بے شمار چاہنے والے پیدا کیے۔ نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر کے کئی ممالک میں انھیں اعزازات سے نوازا گیا۔ انھوں نے ادیبوں کی چار پانچ نسلوں کی نہ صرف ذہنی تربیت کی بلکہ اپنے رسالوں کے ذریعے ان کی بھرپور پذیرائی بھی کی۔ احمد ندیم قاسمی نے عوام سے اپنا رشتہ بنائے رکھا البتہ صاحبان اقتدار سے ہمیشہ ایک شریفانہ دوری برقرار رکھی۔ کروڑوں برس پرانی دنیا میں اب کوئی بات ایسی نہیں رہ گئی ہے جو پہلے نہ کہی گئی ہو۔ تاہم ہر زمانہ اپنے ساتھ اپنی بات کو کہنے کا ایک نیا ڈھنگ اور نیا آہنگ لے کر آتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنے فن کے ذریعے اپنے زمانے کے لب و لہجے کو نیا آہنگ دیا۔

انھوں نے سیکڑوں افسانے لکھے، ہزاروں شعر کہے، ہزاروں کالم اور مضامین لکھے اور اپنی بات کو نہایت وضاحت، صراحت، فراغت، فصاحت اور بلاغت کے ساتھ اپنے قارئین تک پہنچانے کی دیانتدارانہ کوشش کی۔ احمد ندیم قاسمی کی تخلیقات ہمارے ادب کا ایک انمول خزانہ ہیں اور ان کی اس دین کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

آخر میں احمد ندیم قاسمی کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالم نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

خدا نہ کردہ کسی قوم پر یہ وقت آئے
کہ خواب دفن رہیں شاعروں کے سینوں میں

آپ دستار اتاریں تو کوئی فیصلہ ہو
لوگ کہتے ہیں کہ سر ہوتے ہیں دستاروں میں

نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا
حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہی فن یاد آئی

(بہ شکریہ روزنامہ ''سیاست'' حیدرآباد، 15 جولائی 2006)

□□□

مجموعۂ نغز

مصنف: قدرت اللہ قاسم

حکیم ابوالقاسم میر قدرت اللہ المتخلص بہ قاسم کا لکھا ہوا شعرائے اردو کا یہ مشہور تذکرہ، دو جلدوں میں تھا جسے فاضل مرتب پروفیسر محمود شیرانی نے یکجا کر دیا ہے۔ پروفیسر شیرانی کا خیال ہے کہ محمد حسین آزاد کی مشہور تالیف آب حیات کا ایک اہم ماخذ یہ تذکرہ بھی ہے جس کا قلمی نسخہ انھیں آزاد کے ذخیرۂ کتب سے دستیاب ہوا۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 492، قیمت -/268 روپے

عربی ادب کی تاریخ (تین جلدوں میں)

مصنف: ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی

مدارس کے علاوہ ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں عربی زبان و ادب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لیکن اب تک اردو میں کوئی ایسی کتاب دستیاب نہیں تھی جس میں عربی ادب کی جامع اور مبسوط تاریخ بیان کی گئی ہو۔ ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی کی یہ کتاب اس کمی کو پورا کرتی ہے۔ کتاب کی پہلی جلد میں زمانۂ جاہلیت، دوسری جلد میں حضرت محمدؐ کے عہد سے خلفائے راشدین کے عہد نیز اموی دور اور تیسری جلد میں عباسی دور کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: جلد اول: 352، جلد دوم: 390، جلد سوم: زیر طبع
قیمت: جلد اول: 86 روپے، جلد دوم: 91 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

نند کشور وکرم

احمد ندیم قاسمی — ایک ہشت پہلو شخصیت

10 جولائی 2006 کو دنیائے ادب احمد ندیم قاسمی ایسی عظیم المرتبت شخصیت سے محروم ہوگئی جو گذشتہ پون صدی سے اردو ادب کی گراں قدر خدمات انجام دینے میں منہمک تھی اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ ہمارے دور کے ایسے ہشت پہلو ادیب تھے جو اتنے طویل عرصے تک میدانِ ادب میں سرگرم عمل رہے اور ہر صنفِ ادب میں اپنے قلم کے جوہر دکھا کر اتنی غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کی جو بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوئی ہے۔

احمد ندیم قاسمی ایک ایسے منفرد ادیب تھے جو افسانہ نگار کے علاوہ شاعر کی حیثیت سے بھی اردو ادب میں ایک بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ ان کے لگ بھگ ڈیڑھ درجن افسانوی مجموعے شائع ہو کر عوام سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں جن میں چوپال، بگولے، طلوع و غروب، سیلاب، گرداب، آنچل، آس پاس، کپاس کے پھول، در و دیوار، سناٹا، بازارِ حیات، برگِ حنا، گھر سے گھر تک، نیلا پتھر اور کوہ پیما وغیرہ شامل ہیں اور اس میں رتی بھر بھی شک نہیں کہ چوپال سے لے کر کوہ پیما تک انھوں نے ایک طویل فنکارانہ ادبی سفر طے کیا تھا۔

قاسمی صاحب کی زیادہ تر کہانیوں کے پلاٹ اور کردار دیہی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں۔ جس طرح پریم چند نے اتر پردیش کی دیہی زندگی کو اپنا مرکز بنایا اس طرح قاسمی صاحب کی کہانیاں بھی مغربی پنجاب کے گاؤں کی زندگی کے گرد و پیش گھومتی ہیں اور انھوں نے بڑے دل نشیں انداز میں اس دیہی زندگی کی عکاسی کی ہے جہاں ان کا بچپن گزرا تھا اور جس کی مٹی کی بوباس ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی تھی۔ اور یہ گاؤں میں رہنے کا ہی اثر تھا کہ انھیں غریب کسانوں اور مزارعوں سے ہمدردی، اور لوٹ کھسوٹ اور استحصال کرنے والے زمینداروں اور جاگیرداروں سے شدید نفرت ہوگئی۔ اس ہمدردی اور نفرت کے جذبے کا اظہار بعد ازاں انھوں نے اپنی کہانیوں کے کرداروں کے توسط سے کیا اور ان کی زندگی کو ہمارے سامنے بڑے موثر انداز میں پیش کیا۔

اگر چہ قاسمی صاحب کی ابتدائی کہانیوں میں دیہی ماحول اور زندگی کا بول بالا ہے جس میں غریب اور لاچار عوام جاگیرداروں اور زمینداروں کے ذریعہ پریشان اور استحصال کا شکار ہیں۔ مگر بعد ازاں اپنی تخلیقات "سناٹا" اور "بازارِ حیات" میں فن کی ارتقائی منزل طے کرتے ہوئے وہ اس مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں وہ زندہ اور متحرک کردار پیش کرتے ہیں اور ان کی تکنیک میں بھی ارتقائی عمل کچھ تیز ہو گیا ہے۔ اس کے بعد وہ ترقی پذیر دور میں یہ کوشش شعوری طور پر کرتے رہے کہ کرداروں کے اندرونی حالات میں تبدیلی لائی جائے۔ اور بالآخر وہ کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

قاسمی ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے مگر انھوں نے انتہا پسندی کے بجائے ہمیشہ اعتدال پسندی کا راستہ اختیار کیا۔ وہ بعض ترقی پسندوں کے ان نظریات سے قطعی اتفاق نہیں کرتے تھے جو مذہب، خدا کی مخالفت اور دہریت میں ایقان کو ہی ترقی پسندی خیال کرتے ہیں۔ تاہم وہ مارکس واد سے ضرور متاثر تھے اور وہ بھی ملک کے غریبوں کو جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے شکنجے سے نجات دلا کر ایک مساوات اور انصاف پر مبنی نظام لانے کے آرزومند تھے اور اسی مقصد کے تحت انھوں نے اپنی کہانیاں لکھیں۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات بھی استعماریت کے شکار مزدور، غریب عوام، ظالم جاگیردار اور طوائف ہیں اور یہ سب کردار شہری زندگی کے بھی ہیں اور دیہی زندگی کے بھی۔ انھوں نے کبھی بھی سماجی مسائل کو نظر انداز نہیں کیا اور ان کی کہانیوں میں ان کو بڑی اہمیت حاصل رہی۔ مگر ان کی کہانیوں میں نہ تو منٹو کی طرح جنسی چاشنی کی لذت ہے اور نہ کرشن چندر کی طرح رومان میں ڈوبی حسین زندگی۔ یہ سچ ہے کہ ملک کی تقسیم کے بعد ان کی بعض تخلیقات میں جنس کا ذکر ضرور آیا ہے مگر اسے درحقیقت کردار اور پلاٹ کی ضرورت کے پیش نظر ہی بیان کیا گیا ہے۔

قاسمی صاحب کی کہانیوں میں شاعرانہ حسن و جمال جا بجا بکھرا ہوا ہے۔ یہ حسن کبھی کرداروں کی صورت میں تو کبھی ماحول کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر قاسمی صاحب ایک شاعر تھے لہٰذا وہ جمالیات کے بھی پرستار تھے۔ اس کے علاوہ وہ بڑی خوبصورتی سے

اپنی کہانیوں میں تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال کرتے ہیں مگر غیر حقیقی اور دیو مالائی قسم کی کہانیوں سے وہ ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ ان کی کہانیاں ہمیشہ حیات انسانی کے انتہائی نزدیک رہیں ان میں دیو مالائی کردار نہیں بلکہ ہماری طرح گوشت پوست کے چلتے پھرتے انسان ملتے ہیں انھوں نے جو کچھ لکھا تجربے کی روشنی میں لکھا اور حقیقت پر مبنی تخلیقات ہی پیش کیں۔ حقیقت پسندی کو اپنا کر ایک طرح سے انھوں نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کی کہانیوں کے موضوعات معاشی اور سماجی مسائل ہیں جو ہماری زندگی میں ہمیں قدم قدم پر پیش آتے ہیں۔ جنگ کی تباہیاں اور بربادیاں جن کا نشانہ غریب اور حاجت مند افراد کو اپنی مادی ضروریات سے مجبور ہو کر بننا پڑتا ہے، ان کے لیے سوہان روح ہیں۔ دنگے جو انسانیت کے خون کو پانی سے بھی ارزاں بنا دیتے ہیں ان سے بھی انھیں انتہائی نفرت رہی۔ جاگیردارانہ نظام جس میں طاقت ور کمزور کو اپنی طاقت کا نشانہ بناتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام جس میں امیر غریب کا استحصال کرتا ہے، ان موضوعات پر بھی انھوں نے بہت سی کہانیاں قلم بند کیں۔

انھوں نے اپنی کہانیوں میں بعض اوقات ایسی شاعرانہ اور مسحور کن فضا پیدا کر دی جسے پڑھ کر قاری جھوم اٹھتا ہے۔ فطرت اور ماحول کی عکاسی میں ان کا کوئی جواب نہیں، وہ اپنے افسانے کے بنت میں جس مہارت و دسترس کا کمال دکھاتے ہیں وہ بہت کم افسانہ نگاروں کو نصیب ہوا ہے۔ تاہم بعض اوقات وہ بھی واقعات کے بیان میں عام افسانہ نگاروں کی طرح مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہیں اور بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ تاہم ان کی کہانیاں ان کے فنی ارتقا کے ساتھ ساتھ انسانی اور سماجی مسائل پر گہری نظر کی بھی مظہر ہیں۔ جیسا کہ سید وقار عظیم نے ان کی کہانیوں کے بارے میں کہا تھا کہ اگر کوئی قاسمی کی کہانیوں کے بارے میں مجھے ایک جملے میں بیان کرنے کو کہے تو میں کہوں گا کہ ان کی کہانیاں انسانیت اور فن کے اعلیٰ ترین اقدار کی کہانیاں ہیں۔

قاسمی صاحب کی کہانی کے میدان میں بڑی خدمت یہ ہے کہ قارئین کو پرمیشر سنگھ، بین، ہیروشیما سے پہلے، ہیروشیما کے بعد، الحمدللہ، رئیس خانہ، لارنس آف تھلیبا، ثواب اور کنجری ایسی متعدد یادگار کہانیاں دیں لیکن اس کے باوجود آخر عمر تک ان میں یہ تڑپ اور دلی تمنا رہی کہ وہ اردو ادب کو اپنی بہترین تخلیق پیش کریں۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ انھوں نے کبھی ناول لکھنے کی جانب توجہ نہیں دی حالانکہ ان سے کئی بار اس کی فرمائش بھی کی گئی تھی مگر اب کوئی ڈیڑھ دو سال پہلے انھیں اپنے پرانے کاغذات میں خستہ حالت میں ایک ناولٹ کا پرانا مسودہ مل گیا تھا جو دوسری جنگ عظیم سے متعلق ہے جب پنجاب سے رنگروٹوں کی ادھر ادھر بھرتی ہو رہی تھی۔ یہ ناول جنگ کے دور سے شروع ہو کر قیام پاکستان کی تحریک تک کے حالات پر محیط ہے اور اب یہ ''ایک ریوڑ..... ایک انبوہ'' کے عنوان سے فنون میں قسط وار شائع ہو رہا تھا۔

افسانے کی طرح شاعری میں بھی ان کا مقام و مرتبہ بہت بلند رہا ہے۔ ان کی شاعری کے اعلیٰ و بلند معیار کی سب نے تعریف کی ہے۔ جوش ملیح آبادی جیسا شاعر جو بہت کم ہی کسی کی تعریف کرتا ہے، وہ بھی ان کی شاعری کے بے انتہا معترف تھے اور ان کا کہنا تھا کہ شاعری و انسانیت کے پیمبرانہ معیار پر نگاہ کر کے جب قاسمی صاحب کی جانب نظر اٹھاتا ہوں تو بلا خوف ابطال یہ نعرہ لگاتا ہوں کہ قاسمی حقیقی شاعر اور، انسانیت و شعریت کا ایک ایسا دل کشا سنگم ہے جس کا اور چھور نہیں مل سکتا۔

قاسمی صاحب کی شاعری کی ابتدا 1931 میں ہوئی تھی جب مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر ان کی پہلی نظم روزنامہ ''سیاست'' لاہور کے سرورق پر شائع ہوئی اور یہ ان کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ یہی نہیں بعد میں بھی 1934 اور 1937 کے دوران ان کی متعدد نظمیں روزنامہ ''انقلاب'' لاہور اور ''زمیندار'' لاہور کے سرورق پر شائع ہوتی رہیں اور اس سے انھیں عالم نوجوانی میں ہی غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

ابتدا میں قاسمی صاحب نے بھی عام شاعروں کی طرح رومانی انداز و اسلوب اپنایا لیکن اس میں بتدریج تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں اور بالآخر وہ ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اس مقام تک جا پہنچے جہاں ان کی شاعری نے حقیقت پسندی کا نظریہ اپنا لیا اور وہ انسانیت دوستی اور سماجی مساوات و انصاف کی علمبردار بن گئی اور ساتھ ہی اس میں وسعت اور گہرائی بھی در آئی۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ اچھے شاعر کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی تھے۔ انھوں نے انسان دوستی اور امن و آشتی کا دامن کبھی نہیں چھوڑا۔ وہ اپنی شاعری میں نئی زندگی اور نئے نظام کے اقدار کی باتیں کرتے تھے اور اس دھرتی پر نئے آدم کے آنے کے زندگی بھر منتظر رہے جس سے ان کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ نیا آدم جو انسانیت کا پیکر ہوگا اور جس کی آمد سے پیار، امن اور انسان دوستی کے چراغ جگمگا اٹھیں گے اور یہ دھرتی امن کا گہوارہ بن جائے گی۔ ان کی شاعری میں زندگی رواں دواں اور رقصاں محسوس ہوتی ہے کیونکہ وہ حرکت ہی میں زندگی کا حسن پنہاں دیکھتے تھے۔

دیگر نثری اصناف میں بھی انھوں نے اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں اور کئی یادگار کتابیں چھوڑ گئے ہیں۔ انھوں نے تحقیق وتنقید کے میدان میں ''تہذیب وفن''، ''ادب اور تعلیم کے رشتے'' اور ''علامہ محمد اقبال'' جیسی کتابیں پیش کیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے ادیب ساتھیوں کے بارے میں اپنی یادیں ''میرے ہم سفر'' کے نام سے قلمبند کیں جن سے ہمارے عہد کے بہت سے شعرا و ادبا کی زندگی کے کئی عجیب وغریب پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔

علاوہ ازیں انھوں نے میدان صحافت میں بھی نمایاں کردار نبھایا ہے اور اس میدان میں بھی ان کی خدمات کبھی نظر انداز نہیں کی جاسکیں گی۔ انھوں نے اپنے صحافتی سفر کی ابتدا اپنے دور کے مشہور ماہنامے ''ادب لطیف'' کی ادارت سے کی۔ بعد ازاں وہ ''نقوش''، ''سویرا''، ''سحر'' اور روزنامہ ''امروز'' جیسے موقر اخبارات وجرائد سے منسلک رہے اور 1963 میں انھوں نے اپنا مجلہ جریدہ ''فنون'' نکالنا شروع کیا جس کے 140 شمارے ان کی زندگی میں شائع ہو چکے تھے اور جسے برصغیر کے جریدوں میں ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو کے متعدد روزناموں کے لیے فکاہیہ کالم بھی لکھے جنھیں قارئین نے بے حد پسند کیا۔ ان میں ان کے یادگار فکاہیہ کالم حرف وحکایت (امروز) پنج دریا (ہلال پاکستان)، موج درموج (احسان لاہور) لاہور...... لاہور ہے (روزنامہ جنگ کراچی) لاہور یات (روزنامہ حریت کراچی) وغیرہ شامل ہیں۔ اپنی طویل صحافتی زندگی میں انھیں کئی بار نظریاتی معرکہ آرائیوں سے بھی واسطہ پڑا مگر وہ اپنے مخالفین کی باتوں کا جواب بڑے تحمل واعتدال سے دیتے رہے، اور انھوں نے کبھی بھی اپنے معترضین کی طرح شدت اور انتہا پسندی کا راستہ اختیار نہیں کیا۔

بلاشبہ قاسمی صاحب کے انتقال سے ہم ایک ایسی ہشت پہلو شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں جو پون صدی تک میدان ادب میں سرگرم عمل رہی۔ وہ ممتاز افسانہ نگار، غزل اور نظم دونوں پر دسترس رکھنے والے نامور شاعر، موقر اخبارات وجرائد کے کامیاب مدیر، فکاہیہ کالم نویس کے ساتھ ساتھ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور فلم کے میدان میں اپنی تخلیقات کو متواتر پیش کرنے والے واحد سرگرم ادیب تھے۔ انھوں نے شہرت کی ایسی بلندیوں کو چھوا جو بہت کم ادبا و شعرا کو نصیب ہوئی ہے۔ انھوں نے اپنی گراں قدر ادبی خدمات سے جو انمٹ نشان چھوڑے ہیں وہ کبھی مٹ نہ سکیں گے اور اردو شعر و ادب کی تاریخ ان کے ذکر خیر کے بغیر کبھی مکمل نہیں ہو سکے گی۔

F-14/21 (D) Krishan Nagar
Delhi-110051

□□□

توبۃ النصوح

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

''توبۃ النصوح'' اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کا تیسرا ناول ہے جو پہلی بار 1877 میں شائع ہوا۔ اصلاح معاشرہ کے مقصد سے لکھے گئے اس ناول کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے اور یہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ناول کا یہ ایڈیشن اتر پردیش اردو اکادمی کے 1983 میں شائع کردہ نسخے پر مبنی ہے۔

صفحات: 175، قیمت: -/75 روپئے

ابن الوقت

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد نے اس ناول میں انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ابن الوقت، نوبل صاحب اور حجۃ الاسلام کے کرداروں کی مدد سے ناول نگار نے انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم معاشرے کی عکاسی کی ہے جو اس عبوری دور سے گزر رہا تھا۔ ناول کا متن اتر پردیش اردو اکادمی کے 1973 میں شائع کردہ متن پر مبنی ہے۔

صفحات: 225، قیمت: -/91 روپئے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

شاہد اسلم

بے باک صحافی اور عصری حسیت سے ہم آہنگ ادیب

ادب کو وقار و اعتبار بخشنے والی مقتدر ترین شخصیت احمد ندیم قاسمی اب ہمارے درمیان نہیں رہے، البتہ ان کی نگارشات یقیناً اردو ادب اور صحافت کو اعتبار بخشنے میں معاون اور مددگار ثابت ہوں گی۔ قاسمی صاحب کا تعلق اردو کے اس قبیلے سے تھا جس نے ترقی پسندی کی ابتدا سے لے کر مابعد جدیدیت تک کا سفر پورے سلیقے اور شان سے کیا اور عصری حسیت سے ہم آہنگی کے ذریعے ادب وصحافت سے قاری کے رشتے کو مستقل استوار کرتے رہنے کو ترجیح دی۔ احمد ندیم قاسمی اردو ادب کا ایسا منفرد نام ہے جسے سرحدوں کے حصار میں قید کرنے کی ہر کوشش ناکام رہی اور بین الاقوامی اردو برادری نے ان کی عظمت واہمیت کا خندہ پیشانی کے ساتھ نہ صرف اعتراف کیا بلکہ برصغیر میں ان کی حیثیت کو ایک کہنہ مشق شاعر، بزرگ ادیب اور بے باک صحافی کے طور پر شمار میں لایا جاتا رہا۔ کہا جا سکتا ہے کہ احمد ندیم قاسمی وادیِ ادب اور میدان صحافت دونوں شعبوں میں کامیاب ترین زندگی گزارنے والی چند ایک ممتاز ہستیوں میں سے ایک تھے، ورنہ صحافت اور ادب کے مابین اس وقت جو سرد جنگ کا ماحول پیدا ہو چلا ہے اس میں صاحبان قلم نے تو گویا ان دو شعبوں میں سے کسی ایک کو ہی اپنی جنبش تحریر کے لیے مختص کر لیا ہے۔ بلا اختصاص یہ ملکہ احمد ندیم قاسمی کو حاصل تھا کہ وہ جس طرح مختلف اصناف ادب پر عبور کامل رکھتے ہوئے ادبی تقاضے کو خوش اسلوبی کے ساتھ برتنے کا ہنر جانتے تھے، اس نہج پر انھوں نے وادیِ صحافت کو بھی اپنی جرأت مندانہ تحریروں کے ذریعے زرخیزی عطا کی۔

20 نومبر 1916 کو پنجاب کے ایک دور افتادہ علاقے میں پیدا ہونے والے احمد ندیم قاسمی کا ادبی سفر اس وقت شروع ہوا جب برصغیر میں ترقی پسند تحریک ایام طفولیت سے دوچار تھی اور اسے بلوغیت سے ہمکنار کرنے کے لیے ادب نوازوں کا ایک بڑا حلقہ فکری اور تخیلاتی دور سے ہی گزر رہا تھا۔ خواہ پریم چند جیسا سرمایہ کار مخالف صاحب قلم ہو یا فیض جیسا غموں کو پینے والا شاعر، ہر کوئی ترقی پسند فکر کو برتنے کے حوالے سے پس وپیش سے ہی کام لے رہا تھا۔ ایسے عہد میں احمد ندیم قاسمی نے سجاد ظہیر، علی سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، معین احسن جذبی، فیض احمد فیض اور مجروح سلطان پوری جیسے نقیبوں کے تعاون سے سالاری اور سپہ سالاری کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اس فکر کو تحریک کی شکل دینے کی شعوری کوشش کی جس کے نتیجے میں ہی حقیقتاً ترقی پسندی کو اردو ادب میں تحریک کا درجہ حاصل ہوا۔ یہ بات دیگر ہے کہ بعد کو انھوں نے اس تحریکی مشن سے عملاً لاتعلقی اختیار کر لی اور جب ترقی پسند تحریک زوال پذیر ہوگئی تو انھوں نے جدیدیت سے رشتہ استوار کر لیا۔ گویا احمد ندیم قاسمی نے ادب میں عصری حسیت سے بیش از بیش کام لیتے ہوئے اپنی فکر کو ارتقائی صورت بخشنا لازمی گردانا۔ احمد ندیم قاسمی کے تعلق سے حالانکہ یہ بات تقریباً پوشیدہ ہے کہ انھوں نے خاموشی کے ساتھ تحریک سے علاحدگی کیوں اختیار کی؟ تاہم ابھی حال ہی میں انھوں نے اپنی ایک تحریر میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ چند ایک ہم عصروں سے جس ناراضگی کا اظہار کیا اس سے بخوبی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف بطور خاص فیض سے اس وجہ سے نالاں تھے کیونکہ فیض نے ان کو اس طرح سے متعارف نہیں کرایا جس کے وہ مستحق تھے۔

احمد ندیم قاسمی کا سرمایۂ ادب خاصا ضخیم ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی گویا ادب وصحافت کے لیے وقف کی ہوئی تھی۔ انھوں نے مختلف ادب پاروں کی ادارت کا بھی بحسن وخوبی فریضہ انجام دیا۔ یہ موقع اس بات کا نہیں کہ یہاں ترقی پسند تحریک کے آخری سالار احمد ندیم قاسمی کی ادبی وصحافتی زندگی کے جملہ خدمات کا احاطہ کیا جائے کیونکہ موصوف نے اپنی زندگی کو کچھ اس طرح ان دونوں شعبوں سے وابستہ کر رکھا تھا کہ ان کی مکمل تفصیل پر خامہ فرسائی کسی ایک اور مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔ زندگی کے بیشتر ایام انھوں نے مختلف اصناف ادب پر طبع آزمائی میں گزارنے کے

تاریخ وفات

احمد ندیم قاسمی

علم و ہنر کی اس کے زمانے میں دھوم تھی
دانشوروں میں عہد کے اپنے عظیم تھا
آتا نہیں یقین ابھی تک ہمیں کہ جو
"رخصت ہوا ہے ہم سے وہ احمد ندیم تھا"

2006

شوکت جمال (ریاض)

ساتھ ہی ساتھ وادیِ صحافت میں بھی خوب خوب اپنے جوہر دکھائے۔ ان کا تعلق چونکہ مغربی پنجاب سے تھا لہٰذا تقسیم ہند کے بعد بھی انھوں نے پاکستان میں ہی باقی ماندہ زندگی گزارنے کو ترجیح دی۔

یہ صحیح ہے کہ احمد ندیم قاسمی اعلیٰ پائے کے صاحب قلم تھے اور ان کی نگارشات میں پائی جانے والی فکری پختگی اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی انھیں صحافت کا جو بے پناہ تجربہ تھا اور اسے پاکستان کے سیاسی حالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھوں نے جس طرح برتا اس کی نظیر کم ہی ملتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کو جہاں ایک طرف مختلف شعری اصناف پر دسترس حاصل تھی وہیں دوسری جانب انھوں نے ایک کامیاب مدیر کی حیثیت سے بھی اپنا خاصا وقت گزارا۔ کئی برسوں تک ''ادب لطیف'' کے مدیر رہے، جب کہ 1947 میں ''سویرا'' کے چند ابتدائی شماروں کے مدیر کے طور پر بھی انھوں نے کام کیا۔ جب محمد طفیل نے ''نقوش'' کا اجرا کیا تو احمد ندیم قاسمی اس کے مدیر بنے تاہم جلد ہی وہ اس سے الگ ہو گئے۔ 1963 میں انھوں نے اپنے ادبی رسالہ ''فنون'' کا اجرا کیا جو اب تک شائع ہو رہا ہے۔ احمد ندیم قاسمی نے غزل اور نظم دونوں صنفوں میں شاعری کی۔ وہ کچھ عرصہ امتیاز علی تاج کے رسالے ''پھول'' اور ''تہذیب نسواں'' سے وابستہ رہے اور بعد میں ترقی پسند اردو اخبار ''امروز'' کے لیے فکاہیہ کالم لکھتے رہے۔ کالم نگاری میں وہ عبدالمجید سالک کو اپنا استاد مانتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی کا کالم ''پنج دریا'' کے عنوان سے طویل عرصہ تک امروز میں شائع ہوتا رہا۔ بعد میں وہ اس اخبار کے مدیر بھی مقرر ہو گئے لیکن جب 1959 میں اس ادارے کو جنرل ایوب خاں نے سرکاری انتظام میں لیا تو وہ اس سے الگ ہو گئے۔ تاہم اس کے لیے ''عنقا'' کے نام سے کالم لکھتے رہے۔ ''امروز'' کے بعد احمد ندیم قاسمی روزنامہ ''جنگ'' اور بعد میں کراچی سے نکلنے والے روزنامہ ''حریت'' میں بھی کالم لکھتے رہے۔ ان دنوں وہ روزنامہ ''جنگ'' سے کسی حد تک وابستہ تھے۔ وہ 32 سال لاہور میں ادبی ادارہ مجلس ترقی ادب کے ڈائرکٹر کے عہدۂ جلیلہ پر بھی فائز رہے۔

احمد ندیم قاسمی نے 1937 سے شاعری اور افسانہ نگاری شروع کی اور ان دونوں اصناف سخن کے تقاضوں کو بخوبی نبھایا۔ وہ 1949 میں مختصر مدت کے لیے انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری بھی بنائے گئے۔ 1951 میں موصوف پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند کیے گئے۔ 1954 میں انھوں نے انجمن کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ بعد ازاں وہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی الگ ہو گئے۔

ایک بار نہیں متعدد مرتبہ احمد ندیم قاسمی سے پاکستانی روزنامہ ''جنگ'' کی وساطت سے راقم کو رابطے کا موقع ملا۔ دراصل ان کی کئی ایسی تحریریں باصرہ نواز ہوئیں جو پاکستانی ارباب اقتدار کی نظروں میں یقیناً قابل گرفت گردانی جا سکتی تھیں۔ چنانچہ جب انھیں ان کی اس بے باکی پر مبارکباد دینے کا موقع ملا تو مجھے حیرت اس بات کی ہوئی کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ خندہ پیشانی کے ساتھ میرے مراسلے کا جواب عنایت کیا بلکہ انھوں نے صحافتی تقدس کے حوالے سے بڑی مفید اور کارآمد مشوروں سے بھی نوازا۔

احمد ندیم قاسمی کا رخصت ہونا یقیناً جس قدر ادب نوازوں کے لیے باعث صدمہ ہے، اس سے کہیں زیادہ آہنی عزم کے حامل صحافی برادری کے لیے ان کی موت صدمۂ عظیم کا درجہ رکھتی ہے۔ اللہ انھیں غریق رحمت کرے۔

(بشکریہ روزنامہ ''اعتماد'' حیدرآباد، 17 جولائی 2006)

☐☐☐

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

مصنف: خواجہ غلام السیدین

اسکول میں ایک ایسا ماحول بنانا جس میں بچوں کی فطری صلاحیتیں آزاد فضا میں نشوونما پا کر ابھر سکیں، ان کی فطری نشوونما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے لازمی ہے کہ اساتذہ کی تربیت ایک خاص نہج پر کی جائے۔ اس کتاب میں انھی امور پر گفتگو کی گئی ہے۔

صفحات: 307، قیمت: -/98 روپے

خواجہ میر درد

مصنف: ظہیر احمد صدیقی

خواجہ میر درد اردو کے سب سے بڑے صوفی شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے کلام میں تصوف کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ اس کتاب میں درد کے حالاتِ زندگی، ان کی تصانیف، شاعرانہ خصوصیات کے ساتھ ساتھ تصوف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نوآموز طلبہ کے لیے ایک بہترین کتاب۔

صفحات: 64، قیمت: 14 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی- 110066

راشد انور راشد

''رئیس خانہ''— قاسمی کا ایک نمائندہ افسانہ

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''رئیس خانہ'' ان کی غیر معمولی فن کارانہ صلاحیت کی نمائندہ مثال ہے۔ قاسمی کے فن کے بنیادی خصائص یعنی فطرت، معیشت اور محبت اس افسانے میں بھی کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ افسانے کو پڑھ کر پہلا تاثر ذہن میں یوں نقش ہوتا ہے کہ معیشت کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹتے ہوئے افسانہ نگار نے غربت اور استحصال کی ایک ایسی داستان رقم کی ہے جو چند لمحوں کے لیے ہمیں اپنی داستان محسوس ہوتی ہے اور جس کے مختلف کردار ہمارے اندر سرگوشیاں کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ افسانے میں تفہیم کی ایک اور جہت، محبت اور رومان کے تصور سے وابستہ قرار دی جا سکتی ہے۔ افسانے میں محبت کے بدلتے ہوئے رنگ اس افسانے کو دوسرے رومانوی افسانوں سے ممیز کرتے ہیں۔

افسانہ نگار نے قصے کی بنت میں غضب کی ہنرمندی کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کے ہر جملے میں قاری کو اپنے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اور وہ مطالعے کے دوران خود احتسابی کے مرحلے سے بھی دوچار ہوتا ہے۔ اس افسانے میں قاسمی نے جس دنیا کی تخلیق کی ہے وہ دنیا اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ہماری نگاہوں میں متحرک ہو اٹھتی ہے۔ اس کے شب و روز ہمیں اپنی پناہوں میں لے کر ایک خاص نوع کی دردمندی کا احساس دلاتے ہیں اور قصے کی ابتدا اور وسط کے ہوتے ہوئے ہم اختتام سے قبل، جب نقطۂ عروج تک پہنچتے ہیں تو حیرت اور استعجاب کی ملی جلی کیفیتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ کہانی میں راوی کی حیثیت سے افسانہ نگار نے اپنا مقصد حیات بھی واضح کیا ہے جو کہ دبے کچلے کرداروں کی ہمدردی سے وابستہ ہے اور اس ضمن میں یہ نقطۂ نظر، ترقی پسند افکار کی ہی ترجمانی کرتا ہے۔

قاسمی نے افسانے کی ابتدا میں ''رئیس خانہ'' کا تعارف یوں پیش کیا ہے۔

''خاکستری رنگ کے پتھروں کی اس عمارت کو بڑے لوگ مسافر خانہ اور چھوٹے لوگ رئیس خانہ کہتے تھے۔ شاید اس لیے کہ بڑے لوگوں کے لیے ڈاک بنگلہ موجود تھا اور چھوٹے لوگ سرائے میں ٹھہرتے تھے، جہاں صبح اور شام کو وہ بھٹیارے کے پاس تنور کے اردگرد بیٹھ کر موٹی موٹی روٹیوں پر دال کی ڈھریاں لگا کر کھاتے۔ رئیس خانے کے چوکیدار کی بیوی مریاں اور ڈاک بنگلے کے مالی کی بہن بہشتو کے حسن کا مقابلہ کرتے اور چٹخارے بھرتے اور لگے ہاتھوں ایک نظر بھٹیارے کی بیوی پر بھی دوڑا لیتے۔''

ان ابتدائی چند جملوں میں افسانہ نگار، ایک جانب رئیس خانے کا تعارف قاری سے کراتا ہے تو دوسری طرف ایک مخصوص ماحول اور فضا کی تصویر کشی کے ساتھ ہی افسانے کے اہم کرداروں سے بھی تعارف کراتا ہے۔ اس تعارف میں کرداروں کے مخصوص خصائص بھی ہمارے سامنے اجاگر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ مریاں اور بہشتو کے حسن کا ذکر، قاری کے لیے یہ اشارہ بھی فراہم کرتا ہے کہ افسانے میں آگے چل کر ان دونوں کی خوبصورتی اور کشش کے مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہوگی۔ ذیل میں یہ اقتباس ملاحظہ کریں۔

''رئیس خانے کا یہ عالم تھا کہ وہاں رئیس آتے ہی نہ تھے۔ لے دے کے کبھی کبھی شکاری نوجوانوں کی کوئی ٹولی ہرن کی تلاش میں یہاں آنکلتی تو رئیس خانہ میں رک جاتی۔ اس روز فضلو چوکیدار بڑی امیدوں سے چھت کے جالے اتارتا۔ برآمدے کے گوشوں میں پڑی ہوئی چادر کو باہر پھینکتا اور اکلوتے گلدان کے بدبودار پانی اور جلے ہوئے پھولوں کو گرا کر ڈاک بنگلے کے مالی کے نئے پھول مانگ لاتا۔''

مذکورہ بالا اقتباس رئیس خانہ کی اجمالی تصویر کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ نمایاں کرتا ہے۔ افسانہ نگار بڑے سلیقے سے افسانے کے دوسرے اہم کردار فضلو سے بھی ہمیں متعارف کراتا ہے، جو کہ رئیس خانہ کا چوکیدار ہے اور مریاں کا شوہر۔ مریاں اور فضلو کے کردار کو افسانہ نگار نے بڑی مشقت کے ساتھ فطری انداز میں خلق کیا ہے۔ یہ دونوں افسانے کے مرکزی کردار ہیں اور اپنی انفرادی خصوصیات کی بنا پر قاری کے ذہن میں ایک خاص قسم کا نقش قائم کرنے میں پوری طرح کامیاب ہیں۔ یہ بات بات میں جھگڑتے ہیں، ایک دوسرے کو بھدی گالیاں دیتے ہیں۔ لیکن اگلے ہی پل ان کا انوکھا پیار قاری کو ایک نئی کیفیت سے روشناس کراتا ہے۔ ''فضلو نے مریاں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں خشک ہو رہی تھیں، سوج رہی تھیں اور جھکی ہوئی تھیں، لیکن ان میں غم و غصہ نہیں بلکہ پیار کی روشنی تھی۔

''آؤ من جائیں'' وہ بولی'' دایاں ہاتھ ادھر لاؤ'' فضلو اطمینان سے مسکرایا اور اپنا دایاں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مریاں ہنس دی۔ اس

نے بھی فضلو کی گالی کا جواب دینا کچھ ضروری نہ سمجھا وہ جھکی، اس کے ایک گال کو چوما اور پھر اپنا گال آگے کر دیا۔ فضلو نے پہلے تو اسے ہلکا سا طمانچہ مارا، پھر جب وہ سنجیدہ سی بن کر پلٹنے لگی تو فضلو نے اسے جکڑ لیا اور اتنے پیار کیے کہ باہر شیرو چائے پیتا تک بھول گیا۔''

شیرو، مریاں اور فضلو کا چار سالہ بیٹا ہے، جو صاحب لوگوں کی دی گئی بخششوں سے خوب خوب فیض یاب ہوتا ہے۔ پوری کہانی میں یہ ننھا کردار وقفے وقفے سے اپنی موجودگی کا احساس کراتا ہے۔ مریاں اور فضلو کا غصہ جب شدت اختیار کر لیتا ہے تو شیرو کی بدولت ہی ان کے غصے میں کمی آتی ہے۔

افسانے کے چند اہم کرداروں کا مختصر تعارف کرانے کے بعد افسانہ نگار سکیسر نام کی خوبصورت پہاڑی پر اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے۔ یہ سکیسر وہی پہاڑی مقام ہے جہاں افسانہ نگار نے افسانہ ''رئیس خانہ'' کا تانا بانا بنا ہے اور جو کہ کوہستان نمک کی سب سے اونچی چوٹی پر واقع ہے۔ عام دنوں میں تو یہاں کی چوٹیوں اور ٹیشوں میں بکھرے ہوئے بنگلوں کی چمنیوں پر تو الو بولتے اور منڈیروں پر بلیاں لڑتیں۔ لیکن ساون کی پھواروں کے ساتھ ہی سکیسر کی خوبصورتی دیکھتے ہی بنتی۔ افسانہ نگار نے اس پہاڑی مقام کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے۔

''بہار کا پہلا جھونکا درختوں کی سوکھی ہوئی شاخوں پر جگہ جگہ سبز رنگ کے دانے ٹانک جاتا اور چٹانوں کی دراڑوں تک سے نرم نرم گھاس پھوٹ پڑتی، جب نیچے وادی سے ہریالی کی مہک بلندی پر آتی اور بلندی کی ہریالی کی مہک نشیبوں میں اترتی اور وادی میں منتشر ہو جاتی اور نئے سورج کا سونا سکیسر کے قدموں میں لیٹی ہوئی جھیل کی سطح پر آگ لگا دیتا اور پہاڑی ڈھلانوں سے چنے ہوئے کھیت دور دور تک لہلہا اٹھتے تو بنگلوں کی صفائی شروع ہو جاتی۔''

سکیسر کی سحر انگیز فضاؤں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے قاری، مشرق میں پھیلی سون کی وادی اور اس کے حسین سبزہ زاروں میں خود کو موجود پاتا ہے اور جب افسانے کے تیسرے اہم کردار سے افسانہ نگار ہمارا تعارف کراتا ہے، تو پھر کہانی میں دلچسپی کے مزید عناصر پیدا ہونے لگتے ہیں۔ تیسرا کردار یوسف کا ہے جو ایک رئیس زادہ ہے اس کی بیوی مریم شادی کے ایک مہینے بعد ہی اسے دنیا میں تنہا چھوڑ کر چلی گئی، اور اب وہ اس کی جدائی میں ہر لمحہ پھوٹ پھوٹ کر روتا رہتا ہے اور اس کا غم بھلانے کی غرض سے ہی پچھلے سال کی طرح اس سال بھی سکیسر کی چوٹی پر آیا ہے۔ وہ فضلو کو اپنے غم میں شامل کرتے ہوئے اس سے یہ گزارش کرتا ہے کہ اگر ہر رات ایک عورت کا انتظام ہو جائے تو اس کے عوض میں وہ فضلو کے ساتھ عورت کو خاصی رقم دے گا۔ فضلو کے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ صاحب اس سے، ایسی باتیں کر سکتا ہے۔ چند لمحوں کے لیے اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگتی ہے۔ وہ ایک کسان کا بیٹا تھا، غریب تھا، لیکن کمینہ اور کنجر نہیں تھا کہ اس کام کے لیے تیار ہو جاتا۔ اس کے شعور اور ضمیر میں جنگ ہوتی رہی، لیکن بالآخر اس کی اصول پسندی، غربت کے آگے دم توڑ گئی اور وہ صاحب کے لیے کام کرنے کو تیار ہو گیا۔ ہمت کر کے سب سے پہلے اس نے ڈاک بنگلے کے مالی کی بہن بہشتو کو صاحب کے ساتھ رات گزارنے کے لیے راضی کیا۔ لیکن صبح ہونے پر جب بہشتو نے اسے بتایا کہ صاحب نے اسے چھوا تک نہیں اور ساری رات محض پاگلوں کی طرح مستقل دیکھتا رہا تو فضلو کی حیرانی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اس لمحے صاحب، اس کی نظروں میں ولی کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کے دل سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اس نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ بہشتو اور صاحب نے بھی کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ اس خیال سے اسے بہت راحت ملی۔ صاحب، محض عورت کو دیکھا کرتا ہے اور دیکھنے میں برائی بھی کیا ہے۔ دوسری رات کے لیے اس نے بھٹیارے کی بیوی اور تیسری شب وادی کی ایک غریب لڑکی کو اس کام کے لیے بہ آسانی راضی کر لیا اور جب ان دونوں نے بھی صبح ہونے پر فضلو کو یہی بتایا کہ صاحب رات بھر انھیں صرف دیکھتا رہا اور ان کے جسم کو ہاتھ تک نہ لگایا تو فضلو کے دل کو مانو یک گونہ سکون حاصل ہو گیا۔ ساتھ ہی اپنی نادانی پر اسے پچھتاوا بھی ہوتا رہا کہ خواہ مخواہ تین سو روپے ضائع ہو گئے۔ صاحب جب عورتوں کو ساری رات محض دیکھتا ہے تو پھر اس کام کے لیے وہ کسی اور کی مدد کیوں لے؟ اگر اس کی بیوی مریاں ہی اس کام کے لیے راضی ہو جائے تو سو روپے روز کی کمائی سے اچھی خاصی رقم جمع ہو جائے گی اور پھر الگ سے اسے بھی تو پیسے مل رہے ہیں۔ جلد ہی ان پیسوں سے زندگی کے مسائل حل ہونے لگیں گے۔ وہ ڈرتے ڈرتے مریاں کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کرتا ہے۔ مریاں اس کی باتوں کو سن کر آگ بگولہ ہو جاتی ہے اور بھدی گالیوں کے ساتھ اسے خوب کوستی ہے لیکن جب طرح طرح کی قسمیں کھا کر فضلو اسے یقین دلاتا ہے کہ صاحب رات بھر عورت کو صرف دیکھنے کے پیسے دیتا ہے، کسی کو ہاتھ لگایا تو پھر فضلو کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ باقی نہ رہے گا اور وہ اس کا گھر چھوڑ کر کہیں بھی چلی جانے کے لیے آزاد ہو گی۔ فضلو، خوشی خوشی اس کی یہ شرط مان لیتا ہے، لیکن صبح ہونے پر جب وہ مریاں کی خیریت دریافت کرنے رئیس خانے کی طرف جاتا ہے تو وادی میں تیزی کے ساتھ جاتی ہوئی ایک موٹر پر اس کی نظر پڑتی ہے جو کہ رئیس خانہ کے پہلو سے نکل کر وادی میں گم ہو گئی تھی۔ وہ سرپٹ رئیس خانہ کی طرف بھاگتا ہے اور دروازے کو گھونسوں سے کوٹ ڈالتا ہے۔ دروازہ مریاں کھولتی ہے اور وحشت کے عالم میں جو الفاظ اس کے منہ سے ادا ہوتے ہیں، وہ فضلو کو زندہ درگور کرنے کے لیے کافی ہیں......

'' آ پہنچے۔'' مریاں نے کہا '' تم شرط ہار گئے ہو حرامزادے! اس کی

آواز بھرا گئی۔ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ''کمینے، ذلیل، وہ مجھے لوٹ گیا۔ اس نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ رات بھر وہ مجھ سے چمٹا رہا۔ اس نے مجھے نوچا، کھسوٹا، اس نے میرے گال چاٹ ڈالے تم نے کہا تھا کہ وہ مجھے چھوئے گا ہی نہیں اور اس نے تو مجھے کاٹ کاٹ لیا ہے، وہ تو پچھلے ساون میں بھی میرے لیے ہی یہاں رکا رہا۔ اس نے تو پہلے ہی دن یہاں صحن میں مجھے دور بین سے دیکھ لیا تھا۔ وہ تو اب کے بھی میرے ہی لیے آیا تھا۔ سن رہے ہو حرامزادے ''

مگر فضلو وہاں نہ تھا۔ وہ سر جھکائے کوٹھری کی طرف جا رہا تھا۔ مریاں اس کے پیچھے ہولی اور بولتی چلی گئی

''تم شرط ہار گئے، لیکن وہ سو روپے تم اپنے پاس رکھو۔ کہیں سے عزت، آبرو بکاؤ ملے تو چٹکی بھر خرید کر رکھ لینا، کیونکہ آج سے تم پرلے درجے کے بدذات، کمینے اور کنجر ہو گئے ہو۔ سمجھے اور اب میں جا رہی ہوں۔ میں جہاں کہیں بھی جا رہی ہوں، تمھیں اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں اب کسی کی نہیں رہی۔ تم نے میرا غرور توڑ دیا ہے۔ تم نے میرا سب کچھ لٹوا دیا ہے حرامزادے۔''

احمد ندیم قاسمی نے جس ڈرامائی انداز میں کہانی کا نقطۂ عروج بیان کیا ہے وہ ہمیں غیر فطری محسوس نہیں ہوتا۔ غربت کے آگے انسان کی اصول پسندی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ پیسہ ہی اس کے لیے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ضمیر کی آواز وقفے وقفے سے ذہن میں کچوکے لگاتی ہے، لیکن وہ یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے کہ روپیہ ہے تو عزت ہے، نیک نامی ہے، صحت ہے۔ فضلو بھی اپنی غربت سے لاچار ہو کر پیسوں کی خاطر اپنی عزت کا سودا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ وہ بہتر زندگی کے خواب دیکھتا ہے اور پیسے کی بدولت ان خوابوں کی تکمیل کا خواہش مند ہے۔ دراصل احمد ندیم قاسمی نے اس افسانے میں معیشت کو نمایاں پہلو کے طور پر پیش کیا ہے جو ان کے بیشتر افسانوں میں فنکاری کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ معیشت کی حیثیت ان کے افسانوں میں ایک اہم ستون کی ہے۔ اسی ستون پر قصے کی عمارت کا دار و مدار ہوتا ہے۔

فطرت اور معیشت کے ساتھ ایک اور پہلو، احمد ندیم قاسمی کے افسانوں میں اپنی اہمیت کا احساس کراتا ہے اور وہ ہے محبت۔ افسانہ ''رئیس خانہ'' میں بھی زندگی کے اس اہم جزو کی پیشکش فن کاری کے ساتھ دیکھنے کو ملتی ہے۔ محبت کا جذبہ ہی فضلو اور مریاں کو اٹوٹ رشتے میں باندھے رکھتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو کوستے ہیں۔ برا بھلا کہتے ہیں، لیکن محبت کے بندھن سے اپنے آپ کو علاحدہ نہیں کر پاتے۔ محبت کی زیریں لہریں، ان کی رگوں میں لہو کے ساتھ گردش کرتی ہیں اور اس کا اظہار افسانے کے اختتام میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ مریاں جس پر وحشت سوار ہے، وہ فضلو کو چھوڑ کر جانے سے پہلے نفرت سے اس کے منہ پر زور کا طمانچہ مارتی ہے اور تیزی کے ساتھ ڈھوئی کی طرف بھاگنے لگتی ہے لیکن ایک موڑ پر محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر وہ آخری مرتبہ اپنے بچے اور شوہر کو دیکھنے کے لیے پلٹتی ہے۔ شیرو کا گلا چیختے چیختے بیٹھ گیا تھا اور فضلو ایک طرف بے حس و حرکت پڑا تھا۔ کیچڑ اور لہو نے اس کے چہرے کو نہایت خوفناک بنا دیا تھا۔

''میرا فضلو۔'' اس نے فریاد کی۔ پھر اندر کوٹھری میں جا کر چراغ اٹھایا۔ شیرو بھاگ کر آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ وہ فضلو کے چہرے کو قریب لا کر اور اس کے پپوٹے اٹھا کر اس کی پتلیوں میں زندگی کے آثار ڈھونڈنے لگی۔

میرا فضلو، میرا مالک! میرا سائیں۔ اس کے بین چاروں طرف گونج اٹھے اور پھر یکایک تھم گئے۔ فضلو کی آنکھیں ذرا سی کھلیں۔ اس کا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ اٹھا، مٹھی کھلی اور اس نے مٹھی میں دبے ہوئے سو روپے کے نوٹ کو چراغ کی لو سے جلاتے ہوئے کہا ''میں تمھیں کہیں جانے دوں گا، تم مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ، تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں مجھے میری فریبی دھوکا دے گئی مریاں۔''

کہانی کا یہ اختتام۔ محبت کے جذبے کی بنا پر ہی ممکن ہو پایا ہے۔ اس انجام کے علاوہ افسانہ نگار کہانی میں کوئی اور موڑ شامل کرتا تو یہ افسانہ شاید فطری حسن سے محروم ہو جاتا۔ محبت کی زیریں لہروں کی بنا پر ہی کہانی ہر قدم پر قاری کو اپنی گرفت میں مقید رکھتی ہے اور اختتام میں محبت کا جذبہ ہی زندگی کو سہارا دیتا ہے۔

ڈاک بنگلے کے صاحب کا کردار ایک شاطر، عیار اور عیش و عشرت میں ڈوبے رئیس کا کردار ہے جو اپنے مقصد کے حصول کے لیے طرح طرح کی سازشیں رچتا ہے اور اس سلیقے کے ساتھ کہ کوئی بھی اس کے ارادے سے آگاہ نہیں ہو پاتا۔ پہاڑی مقام کی سیدھی سادی زندگی میں نت نئے موڑ اسی سازشی کردار کی بنا پر کرتے ہیں۔

افسانہ نگار نے کرداروں کی شخصیات کو ابھارنے کے دوران حسب حال مکالمے تخلیق کیے ہیں اور زبان و بیان کے ذریعے ان کی نفسیات کو خوبصورتی کے ساتھ اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ سب کچھ کہہ دینے کے بجائے وہ بہت کچھ سینۂ راز میں رکھنا چاہتے ہیں تاکہ نفسیاتی اجمال اور شاعرانہ ایجاز قائم رہے۔

Department of Urdu
AMU, Aligarh (U.P.)

□□□

تذکشور وکرم

سوانحی اشارے

نام: احمد شاہ

تاریخ ولادت: 20 نومبر 1916، انگہ تحصیل وضلع خوشاب، پنجاب پاکستان

والد: پیر غلام نبی، وفات 1924

والدہ: ......وفات 1956

بھائی: بڑے بھائی پیرزادہ محمد بخش۔ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔

بہن: ایک بڑی بہن (ممتاز صحافی ظہیر بابر کی والدہ) جن کا 1960 میں انتقال ہوا۔

چچا: پیرزادہ حیدر بخش جنھوں نے قرآن مجید کی تفسیر پڑھائی۔

ازدواجی زندگی: شادی 1948 میں خاندان کے قریبی عزیزوں میں ہوئی جو وادیٔ سوں کے گاؤں سورکی میں آباد ہیں۔

اولاد:

1. بڑی بیٹی۔ ناہید ندیم (ناہید قاسمی) شاعرہ ہیں۔
2. نشاط ندیم شعر بھی کہتی تھیں، 1995 میں انتقال ہوگیا۔
3. بیٹا نعمان ندیم۔

تعلیم: 1920 میں انگہ کی مسجد میں قرآن مجید کا درس، 25-1921 میں گورنمنٹ مڈل اینڈ نارمل اسکول کیمبل پور (اٹک) میں تعلیم پائی۔ 31-1930 میں گورنمنٹ ہائی اسکول شیخو پورہ میں زیر تعلیم اور 1931 میں میٹرک۔ 1931 میں صادق ایجرٹن کالج بہاولپور میں داخل ہوئے، 1935 میں بی۔اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔

پہلا شعر: 27-1926 میں پہلا شعر کہا۔

پہلی مطبوعہ تخلیقات: پہلی نظم 1931 میں مولانا محمد علی جوہر کی وفات پر کہی جو روزنامہ 'سیاست' لاہور میں چھپی۔ پہلا شعری مجموعہ 1942 میں اردو اکیڈمی لاہور سے اور پہلا افسانوی مجموعہ 1939 میں شائع ہوا۔

ملازمت: 1936 میں ریفارمز کمشنر لاہور کے دفتر میں بیس روپے ماہوار پر محرر کی حیثیت سے ملازم ہوئے اور 1937 تک یہیں کام کرتے رہے۔ 41-1939 کے دوران ایکسائز سب انسپکٹر، 48-1945 میں ریڈیو پشاور سے بحیثیت اسکرپٹ رائٹر وابستہ۔

صحافتی سرگرمیاں: 45-1941 میں ہفت روزہ 'پھول' اور 'تہذیب نسواں' 45-1943 میں ماہنامہ ادب لطیف، 48-1947 میں ماہنامہ سویرا (چار شماروں) 1950 میں ماہنامہ ''سحر'' لاہور (ایک شمارہ) 59-1953 میں روزنامہ ''امروز'' لاہور کی ادارت کی اور اب 1964 سے ماہنامہ ''فنون'' کی ادارت کر رہے ہیں۔

1952 میں روزنامہ 'امروز' لاہور میں کالم ''حرف و حکایت'' پھر اس اخبار کے ایڈیٹر بن جانے پر کالم ''پنج دریا'' بھی لکھتے رہے۔ 1959 میں امروز سے الگ ہونے پر روزنامہ ''ہلال پاکستان'' میں ''موج در موج'' اور 'پنج دریا' کے نام سے فکاہیہ کالم نویسی۔ 70-1964 میں روزنامہ ''امروز'' لاہور میں کالم ''حرف و حکایت'' کی شروعات کی مگر پنج دریا کے بجائے نام ''عنقا'' رکھ لیا۔ اسی دوران روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں کالم ''لاہور...... لاہور ہے۔'' پھر جنگ کو چھوڑ کر روزنامہ ''حریت'' کراچی میں فکاہیہ کالم ''موج در موج'' اور ہفتہ وار کالم ''لاہوریات'' پیش کرتے رہے۔ اپریل 1972 میں دوبارہ امروز میں وہی کالم لکھنے لگے۔ 1964 سے امروز لاہور میں ادبی، علمی اور تہذیبی موضوعات پر ہر ہفتے مضامین لکھتے رہے۔

مطبوعات: افسانوی مجموعے:

1. چوپال (دارالاشاعت پنجاب لاہور 1939)
2. بگولے (مکتبہ اردو لاہور 1941)
3. طلوع وغروب (مکتبہ اردو، لاہور، 1942)

4. گرداب (ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن 1943)
5. سیلاب (ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد دکن 1943)
6. آنچل (ادارہ فروغ اردو، لاہور 1944)
7. آبلے (ادارہ فروغ اردو لاہور 1946)
8. آس پاس (مکتبہ فسانہ خواں، لاہور 1948)
9. در و دیوار (مکتبہ اردو، لاہور 1948)
10. سناٹا (نیا ادارہ لاہور 1952)
11. بازارِ حیات (ادارہ فروغ اردو، لاہور 1959)
12. برگِ حنا (ناشرین، لاہور 1959)
13. سیلاب و گرداب (مکتبہ کارواں، لاہور 1961)
14. گھر سے گھر تک (راول کتاب گھر، راولپنڈی 1963
15. کپاس کا پھول (مکتبہ فنون، لاہور 1973)
16. نیلا پتھر (غالب پبلشرز، لاہور 1980)
17. کوہ پیما (اساطیر، لاہور۔ 1995)

شاعری:

1. دھڑکنیں (قطعات، اردو اکیڈمی۔ لاہور) 1942
2. رم جھم (قطعات و رباعیات، ادارہ فروغ اردو۔ لاہور 1944
3. جلال و جمال (شاعری۔ نیا ادارہ، لاہور 1946)
4. شعلۂ گل (قومی دارالاشاعت لاہور 1953)
5. دشتِ وفا (کتاب نما، لاہور 1963)
6. محیط (التحریر، لاہور 1976)
7. دوام (مطبوعات لاہور 1979)
8. لوح و خاک (اساطیر لاہور 1988)

تحقیق و تنقید:

1. تہذیب و فن (پاکستان فاؤنڈیشن لاہور 1975)
2. ادب اور تعلیم کے رشتے (التحریر، لاہور 1974)
3. علامہ محمد اقبال

ترتیب و ترجمہ:

1. انگڑائیاں (مرد افسانہ نگاروں کا انتخاب، ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن 1944)
2. نقوشِ لطیف (خواتین افسانہ نگاروں کا انتخاب، ادارہ اشاعت اردو حیدرآباد دکن 1944)
3. پاکستان کی لوک کہانیاں (از میریلین سرچ، ترجمہ، شیخ علی اینڈ سنز لاہور)

4. کیسر کیاری (مضامین، ڈرامے، تراجم، مکتبہ شعر و ادب، لاہور 1944
5. منٹو کے خطوط بنام احمد ندیم قاسمی (ترتیب، کتاب نما، لاہور 1966
6. نذیر حمید احمد خاں (ترتیب، مجلس ترقی ادب، لاہور 1977) میرے ہم سفر

بچوں کا ادب:

1. تین ناٹک (پنجاب بک ایجنسی، لاہور 1944
2. دوستوں کی کہانیاں (پنجاب بک ایجنسی، لاہور 1944
3. نئی نویلی کہانیاں (پنجاب بک ایجنسی، لاہور 1944)

قاسمی سے متعلق کتابیں اور خصوصی نمبر:

1. ندیم کی شاعری اور شخصیت (تحقیق) جمیل ملک۔
2. احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانے، مرتبہ مظفر علی سید
3. ندیم نامہ مرتب محمد طفیل، بشیر موجد مجلسِ اربابِ فن، لاہور 1974
4. مٹی کا سمندر مرتب ضیا ساجد مکتبہ القریش لاہور 1991
5. احمد ندیم قاسمی...... ایک لیجنڈ از شکیل الرحمٰن۔ اساطیر لاہور
6. ندیم نمبر مرتب صہبا لکھنوی ماہنامہ افکار کراچی 1976
7. احمد ندیم قاسمی: شخصیت اور فن مرتب: نند کشور وکرم۔ عالمی اردو ادب دہلی۔1996۔

ہندی میں ''اردو کہانی کار احمد ندیم قاسمی'' مرتب نند کشور وکرم اندر پرستھ پرکاشن دہلی۔

اس کے علاوہ انگریزی، روسی، چینی، جاپانی، ہندی، پنجابی، بنگلہ، سندھی، گجراتی مراٹھی اور فارسی وغیرہ متعدد زبانوں میں کہانیوں اور شاعری کے تراجم۔

اعزازات و انعامات:

آدم جی ادبی ایوارڈ برائے دشتِ وفا (شاعری۔1963) آدم جی ادبی ایوارڈ برائے محیط (شاعری۔ 1976) آدم جی ادبی ایوارڈ برائے دوام (شاعری۔ 1979) پرائیڈ آف پرفارمنس حکومتِ پاکستان کا اعلیٰ سول اعزاز (1968) ستارۂ امتیاز حکومتِ پاکستان کا اعلیٰ ترین سول اعزاز (1980) عالمی فروغِ اردو ادب، دوحہ قطر۔

وفات: 10 جولائی 2006، لاہور (پاکستان)۔

□□□

احمد ندیم قاسمی

نظمیں

عنوانِ شباب

شبنم آئینہ بدست آئی سرِ برگِ گلاب
ایک معصوم کلی
شاخساروں سے ہمک کر نکلی
آئینہ دیکھ کے شرمائی لجائی، کانپی
جھرجھری لے کے سنبھلنا چاہا
لیکن احساسِ جمال
ایک کوندا ہے جو پہلے تو لپکتا ہی چلا جاتا ہے
اور معصوم کلی
کپکپاہٹ کے تسلسل سے چٹکنے پہ جو مجبور ہوئی
چور ہوئی
غنچۂ تخلیق ہوا
آئینہ چونک اٹھا

○

گونج

رات کا پُر وقار سناٹا
گونجتی ہے صدائے پائے نجوم
اصل میں گونج ہے سکوت کا گیت
اور پھر کس قدر لطیف و بسیط
گونج ہی گونج کبریا کی ذات
گونج ہی گونج ماورائے حیات
یہ حقیقت مگر کسے معلوم!
زندگی گونج کے سوا کیا ہے
ایک انسان، دوسرے کا نقیب
پھول کی گونج پھول کی مہکار
اور یہی ہے اثاثۂ گلزار
ایک اک پھول گلستاں کا غرور
ایک اک آدمی جہاں کا غرور
کاش سب کو مری نظر ہو نصیب!

(اقتباس)

○

انسان

خدا عظیم، زمانہ عظیم، وقت عظیم
اگر حقیر ہے کوئی یہاں تو صرف ندیم
وہی ندیم، وہی لاڈلا بہشتوں کا
وہی ندیم، جو مسجود تھا فرشتوں کا
وہ جس نے جبر سے وجدان کو بلند کہا
وہ جس نے وسعتِ عالم کو اک زقند کہا
وہ جس نے جرمِ محبت کی جب سزا پائی

احمد ندیم قاسمی کی نظموں، غزلوں اور قطعات کا یہ مختصر انتخاب ان کے شعری مجموعوں ''شعلۂ گل'' ''دشت وفا'' ''دوام'' اور ''بسیط'' سے کیا گیا ہے اور تمام تخلیقات زمانی ترتیب سے دی گئی ہیں۔ اس شعری انتخاب کے ساتھ ساتھ ہم نے ان کا ایک بہت ہی غیر معمولی افسانہ ''بین'' بھی شریکِ اشاعت کیا ہے۔ اس سے قبل ہم ان کا ایک اور بہت اچھا افسانہ ''پرمیشر سنگھ'' اپنے قارئین تک پہنچا چکے ہیں۔

تو کائنات کے صحراؤں میں بہار آئی
وہ جس نے فرش کو بھی عرش کا جمال دیا
وہ جس نے تند عناصر کو ہنس کے ٹال دیا
بڑھا تو راہیں تراشیں، رُکا تو قصر بنائے
اُڑا تو گیت بکھیرے، جھکا تو پھول کھلائے
وہ جس کے نام سے عظمت قسم اٹھاتی ہے
اسی کی آج خدائی ہنسی اڑاتی ہے
نہیں — کسی سے بگڑنا مرا سبھاؤ نہیں
مری سرشت میں گلزار ہیں، الاؤ نہیں
ہزار بار شکستوں پہ مسکرایا ہوں
مصیبتوں کی گرج میں بھی گنگنایا ہوں
اگر حریم بقا سے فنا ملی ہے مجھے
اسی فنا میں بقا کی ادا ملی ہے مجھے
خدا شناس بھی ہوں اور خود شناس بھی ہوں
خدا سے دور بھی ہوں اور خدا کے پاس بھی ہوں
یہاں زمیں پہ بھی تخلیق کام ہے میرا
کہ کبریائی سے منسوب نام ہے میرا
زمیں مری ہے، فضا بھی مری، خلا بھی مری
خلا مری ہے تو اقلیم ماورا بھی مری
خدا کے ذہن کا فن پارۂ عظیم ہوں میں
تمام دہر کا دولھا ہوں میں — ندیم ہوں میں

(''شعلۂ گل'') اپریل 1947

○

وقت

سر برآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
چاند بلور کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کی طرح اٹکا ہے
دامنِ کوہ کی اک بستی میں
ٹمٹماتے ہیں مزاروں پہ چراغ
آسماں سرمئی مخمل میں ستارے ٹانکے
سمٹا جاتا ہے، جھکا آتا ہے
وقت بیزار نظر آتا ہے!

سر برآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
صبح کی نقرئی تنویر رچی جاتی ہے
دامنِ کوہ میں بکھرے ہوئے کھیت
لہلہاتے ہیں تو دھرتی کے تنفس کی صدا آتی ہے
آسماں کتنی بلندی پہ ہے اور کتنا عظیم
نئے سورج کی شعاعوں کا مصفا آنگن
وقت بیدار نظر آتا ہے!

سر برآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
آفتاب ایک الاؤ کی طرح روشن ہے
دامنِ کوہ میں چلتے ہوئے ہل
سینۂ دہر پہ انسان کے جبروت کی تاریخ رقم کرتے ہیں
آسماں تیز شعاعوں سے ہے اس درجہ گداز
جیسے چھونے سے پگھل جائے گا
وقت تیار نظر آتا ہے!

سر برآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
زندگی کتنے حقائق کو جنم دیتی ہے
دامنِ کوہ میں پھیلے ہوئے میدانوں پر
ذوقِ تخلیق نے اعجاز دکھائے ہیں لہو اُگلا ہے
آسماں گردشِ ایام کے ریلے سے ہراساں تو نہیں
خیر مقدم کے بھی انداز ہوا کرتے ہیں
وقت کی راہ میں موڑ آتے ہیں، منزل تو نہیں آسکتی!

(''شعلۂ گل'') 1949

○

فکر

راتوں کی بسیط خامشی میں
جب چاند کو نیند آ رہی ہو
پھولوں سے لدی خمیدہ ڈالی
لوری کی فضا بنا رہی ہو

جب جھیل کے آئنے میں گھل کر
تاروں کا خرام کھو گیا ہو

ہر پیڑ بنا ہوا ہو تصویر
ہر پھول سوال ہو گیا ہو

جب خاک سے رفعتِ نما تک
ابھری ہوئی وقت کی شکن ہو
جب میرے خیال سے خدا تک
صدیوں کا سکوت خیمہ زن ہو

اس وقت مرے سلگتے دل پر
شبنم سی اتارتا ہے کوئی
یزداں کے حریم بے نشاں سے
انساں کو پکارتا ہے کوئی

(''دشتِ وفا'') دسمبر 1953

○

بولنے دو

بولنے سے مجھے کیوں روکتے ہو؟
بولنے دو، کہ میرا بولنا دراصل گواہی ہے مرے ہونے کی
تم نہیں بولنے دو گے تو میں سناٹے کی بولی ہی میں بول اٹھوں گا

میں تو بولوں گا
نہ بولوں گا تو مر جاؤں گا
بولنا ہی تو شرف ہے میرا

کبھی اس نکتے پہ بھی غور کیا ہے تم نے
کہ فرشتے بھی نہیں بولتے
میں بولتا ہوں
حق سے گفتار کی نعمت فقط انساں کو ملی
صرف وہ بولتا ہے
صرف میں بولتا ہوں
بولنے مجھ کو نہ دو گے تو مرے جسم کا ایک ایک مسام بول اٹھے گا
کہ جب بولنا منصب ہی فقط میرا ہے
میں نہ بولوں گا تو کوئی بھی نہیں بولے گا

○

چاند

اسے میں نے دیکھا
تو سوچا
کہ اب چاند نے
اپنے سورج سے
لو مانگنا چھوڑ دی ہے!

(''دوام'') جنوری 1976

○

پت جھڑ کی تنہائی

عجب خال و خد تھے!
ستارہ سی آنکھیں
شرارہ سے لب
اور صحیفہ سا چہرہ!
بدن—اک چمن
چال—بادِ صبا
بات—خوشبو
محبت—بہت گہری آسودگی فصلِ گل کی!
مگر آج وہ خال و خد دیکھ کر سوچتا ہوں
کہ میری بصارت کو پت جھڑ کی تنہائی نے کھا لیا ہے

(''دوام'') جنوری 1976

○

منفیت کا منشور

چلو کچھ اور سوچیں
ہم نے اب تک جو بھی سوچا ہے
وہ صدیوں کی پرانی سوچ ہے
اب عہد جو ہر ہے
یہ وہ لمحہ ہے
جس کے شہپروں پر بیٹھ کر

ہم کوزمیں سے اپنا ناتا توڑتا اور آسماں سے جوڑ لیتا ہے

چلو کچھ اور سوچیں
اب یہ دنیا
اور انساں
اور اس کے دُکھ
پرانے، کرم خوردہ، بھربھرے، بدرنگ، بے لذت فسانے ہیں

چلو کچھ اور سوچیں
اور محبت کی بساطیں تہہ کریں
اور حسن کی قدریں بدل ڈالیں
چمکتی دھوپ پر
اور چاندنی راتوں پہ لعنت بھیج کر
پھولوں پہ تھوکیں
ندیوں کو پتھروں سے پاٹ دیں
رشتوں کو کاٹیں
رابطوں کو روند ڈالیں
سولیاں گاڑیں

چلو کچھ اور سوچیں
لفظ سے مفہوم کی دولت اچک لیں
اور اسے پتھر بنا ڈالیں
زبانیں نوکِ خنجر کی طرح سینوں میں گاڑیں
نغمگی کو چیخ میں بدلیں
سمندر خشکیوں پر کھینچ لائیں
وادیوں میں دلدلیں بھر دیں

چلو کچھ اور سوچیں
اب یہی سوچیں
کہ جو کچھ آدمی نے آج تک سوچا ہے
وہ سب کفر ہے
اور حق فقط یہ ہے
کہ جو کچھ ہے
نہیں ہے
کچھ نہیں ہے

واہمہ ہے
خواب ہے
اور خواب سوچوں کی قدامت کا نتیجہ ہیں!

("دوام") جنوری 1976

○

خواب

چاندنی نے رنگِ شب جب زرد کر ڈالا — تو میں
ایک ایسے شہر سے گزرا — جہاں
صرف دیواریں نمایاں تھیں
چھتیں معدوم تھیں
اور گلیوں میں فقط سائے رواں تھے
جسم غائب تھے!

○

دعا

مجھے مژدۂ کیفیتِ دوامی دے
مرے خدا! مجھے اعزازِ ناتمامی دے
میں تیرے چشمۂ رحمت سے شادکام تو ہوں
کبھی کبھی مجھے احساسِ تشنہ کامی دے
مجھے کسی بھی معزز کا ہمرکاب نہ کر
میں خود کماؤں جسے، بس وہ نیک نامی دے
وہ لوگ جو کئی صدیوں سے ہیں نشیب نشیں
بلند ہوں، تو مجھے بھی بلند بامی دے
تری زمین پہ تیرے چمن رہیں آباد
جو دشتِ دل ہے، اسے بھی تو لالہ فامی دے
بڑا سرور سہی تجھ سے ہمکلامی میں
بس ایک بار مگر ذوقِ خود کلامی دے
میں دوستوں کی طرح خاک اڑا نہیں سکتا
میں گردِ راہ سہی، مجھ کو نرم گامی دے

اگر کروں تو کچھ اس طرح سربلند کروں
کہ مار کر، مرا دشمن مجھے سلامی دے

("دوام") مارچ 1976

○

لاتعداد

ابھی وقت کے ہاتھ میں
ایک شاخِ شکستہ تو ہے
اس کے سائے میں چلنا
بڑا لطف دے گا
کہ جو سورجوں کی تمازت میں جلتے رہے
یہ نہیں دیکھتے
ان پہ جس شاخ کی چھاؤں ہے
اس میں پتوں کی تعداد کیا ہے

("بسیط") فروری 1989

○

ایک نظریے کا نوحہ

وہ جو عشق پیشہ تھے
دل فروش تھے
مر گئے!
وہ ہوا کے ساتھ چلے تھے
اور ہوا کے ساتھ بکھر گئے
وہ عجیب لوگ تھے
برگِ سبز کو برگِ زرد کا روپ دھارتے دیکھ کر
رخِ زرد اشکوں سے ڈھانپ کر
بھرے گلشنوں سے
مثالِ سایۂ ابر
پل میں گزر گئے

وہ قلندرانہ وقار تن پہ لپیٹ کر
گھنے جنگلوں میں گھری ہوئی کھلی وادیوں کی بسیط دھند میں
رفتہ رفتہ اتر گئے!

("بسیط") اپریل 1989

○

مجروح

جہاں بھی ہاتھ لگایا، تمام زخم تھا جسم
مری قبا سے تو ملبوسِ قیس بہتر تھا
خراشیں سر سے مری ایڑیوں تک آ پہنچیں
ادھر سے تیر چلے اور ادھر سے شمشیریں
کہیں ہے ضرب تبر کی، کہیں ہے نیزے کی
میں اک جہاں کا ہدف ہوں، کہ مجھ سے جیتے جی
کسی بھی ظلم کی تائید کا نہ جرم ہوا
میں بارگاہِ شہی میں بھی سربلند رہا

(جولائی 1992)

○

ڈیپریشن

کہاں گئی ہیں وہ صبحیں، کدھر گئیں شامیں؟
کہاں گئے وہ طلوع و غروب کے منظر؟
نہ ظلمتیں، نہ اجالے، نہ رات اور نہ دن
یہاں سے حدِ نظر تک ہے ملگجی سی فضا
بچھا ہوا ہے زمیں پر بسیط سناٹا
صدا کہیں سے بھی آتی نظر نہیں آتی
سماعتوں پہ گھنی خامشی کے پہرے ہیں

(جولائی 1992)

○

احمد ندیم قاسمی

غزلیں

ابھی نہیں اگر اندازۂ سپاس ہمیں
تو کیوں ملی تھی بھلا تابِ التماس ہمیں

افق افق پہ نقوشِ قدم نمایاں ہیں
تلاش لائی کہاں سے تمھارے پاس ہمیں

کبھی قریب سے گزرے، بدن چرائے ہوئے
تو دور تک نظر آتے رہے اداس ہمیں

جو ہو سکے تو اس ایثار پر نگاہ کرو
ہماری آس جہاں کو، تمھاری آس ہمیں

ڈبو چکا ہے امنگوں کو جس کا سناٹا
بلا رہا ہے اسی بزم سے قیاس ہمیں

یہ پوچھنا ہے، کب آدم زمیں پہ اترے گا
جو لے چلے کوئی کامل، خدا کے پاس ہمیں

یہیں ملیں گے تمھیں پھول بھی، ستارے بھی
بتا رہی ہے دلآویزیٔ لباس ہمیں

("شعلۂ گل")1947

○

میں کب سے گوش برآواز ہوں، پکارو بھی
زمین پر یہ ستارے کبھی اتارو بھی

مری غیور امنگو، شباب فانی ہے
غرورِ عشق کا دیرینہ کھیل ہارو بھی

سفینہ محوِ سفر ہو تو نارسیدہ نہیں
قدم قدم پہ کنارے ہیں، تم سدھارو بھی

مرے خطوط پہ جمنے لگی ہے گردِ حیات
اداس نقش گرو، اب مجھے نکھارو بھی

بھٹک رہا ہے دھندلکوں میں کاروانِ خیال
بس اب خدا کے لیے کاکلیں سنوارو بھی

مری تلاش کی معراج ہو تمھی لیکن
نقاب اُٹھاؤ، نشانِ سفر ابھارو بھی

یہ کائنات ازل سے سپردِ انساں ہے
مگر ندیم! تم اس بوجھ کو سہارو بھی

("شعلۂ گل")1947

○

بڑی مانوس لے میں ایک نغمہ سن رہا ہوں میں
کسی ٹوٹی ہوئی چھاگل کی کڑیاں چن رہا ہوں میں

یہاں اب ان کے اظہارِ محبت کا گزر کیا ہو
کہ سناٹے کی موسیقی پہ بھی سر دھن رہا ہوں میں

شبِ وعدہ ابھی تک ختم ہونے میں نہیں آئی
کہ برسوں سے مسلسل ایک آہٹ سن رہا ہوں میں

تصور میں ترے پیکر کا سونا گھل گیا ہوگا
ابھی تک لمس کی کیفیتوں میں بھن رہا ہوں میں

خدا کا شکر، احساسِ زمیں مرنے نہیں پایا
ستارے چننے نکلا تھا، شرارے چن رہا ہوں میں

("شعلۂ گل")1960

○

ہجومِ فکر و نظر سے دماغ جلتے ہیں
وہ تیرگی ہے کہ ہر سو چراغ جلتے ہیں

کچھ ایسا تند ہوا جا رہا ہے بادۂ زیست
کہ ہونٹ کانپتے ہیں اور ایاغ جلتے ہیں

چٹک رہے ہیں شگوفے، دہک رہے ہیں گلاب
وفورِ موسمِ گل ہے کہ باغ جلتے ہیں

نہیں قریب تو کچھ دور بھی نہیں وہ دور
شفق کے روپ میں جس کے سراغ جلتے ہیں

ترے نصیب میں راتیں، مرے نصیب میں دن
ترے چراغ، مرے دل کے داغ جلتے ہیں

("قطعۂ گل") 1950

○

شام کو صبحِ چمن یاد آئی
کس کی خوشبوئے بدن یاد آئی

جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شکن یاد آئی

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاہیِ فن یاد آئی

چاند جب دور اُفق پہ ڈوبا
تیرے لہجے کی تھکن یاد آئی

دن شعاعوں سے اُلجھتے گزرا
رات آئی تو کرن یاد آئی

("دشتِ وفا") 1953

○

انجمنیں اجڑ گئیں، اٹھ گئے اہلِ انجمن
چند چراغ رہ گئے، جن کی لویں ہیں سینہ زن

اب ترا التفات ہے، حادثۂ جمال و فن
اندھے عقاب کی اڑان، زخمی ہرن کا بانکپن

ہائے یہ مختصر حیات، ہائے یہ اک طویل رات
اے مرے "دوست" اک نظر اے مرے چاند، اک کرن

حسن اگر جھکا رہا، بردرِ خسروانِ دہر
کٹتے رہیں گے کوہسار، مرتے رہیں گے کوہکن

اترے ہیں برگہائے زرد لالہ وگل کے روپ میں
ایسے نحیف جسم پر، اتنا حسین پیرہن

("دشتِ وفا") اپریل 1956

○

کتنے خورشید بیک وقت نکل آئے ہیں
ہر طرف اپنے ہی پیکر کے گھنے سائے ہیں

ذہن پر تنگ ہوا جب بھی اندھیرے کا حصار
چند یادوں کے دریچے ہیں، جو کام آئے ہیں

کون کہتا ہے، محبت ہے فقط جی کا زیاں
ہم تو اک دل کے عوض حشر اٹھا لائے ہیں

کتنے پل کے لیے وہ زینتِ آغوش رہے
کتنے برسوں کے مگر زخم نکھر آئے ہیں

گونج گونج اٹھتی ہے آوازِ شکستِ دل کی
جب بھی تارہ کوئی ٹوٹا ہے، وہ یاد آئے ہیں

داستانِ غمِ دنیا ہو کہ افسانۂ دل
وہی قصے ہیں جو ہر دور نے دہرائے ہیں

سینۂ ارض میں بیدار ہے احساسِ جمال
جب سے فن کار ستاروں سے اُتر آئے ہیں

اے سحر، آج ہمیں راکھ سمجھ کر نہ اُڑا
ہم نے جل جل کے ترے راستے چمکائے ہیں

("دشتِ وفا") اگست 1957

○

فاصلے کے معنی کا کیوں فریب کھاتے ہو
جتنے دور جاتے ہو، اتنے پاس آتے ہو

رات ٹوٹ پڑتی ہے جب سکوتِ زنداں پر
تم مرے خیالوں میں چھپ کے گنگناتے ہو

میری خلوتِ غم کے آہنی دریچوں پر
اپنی مسکراہٹ کی مشعلیں جلاتے ہو

جب تنی سلاخوں سے جھانکتی ہے تنہائی
دل کی طرح پہلو سے لگ کے بیٹھ جاتے ہو
تم مرے ارادوں کے ڈوبتے ستاروں کو
یاس کی خلاؤں میں راستہ دکھاتے ہو
کتنے یاد آتے ہو، پوچھتے ہو کیوں مجھ سے
جتنا یاد کرتے ہو اُتنے یاد آتے ہو

("دشتِ وفا") دسمبر 1958

○

تو جو بدلا تو زمانہ ہی بدل جائے گا
گھر جو سلگا تو بھرا شہر بھی جل جائے گا
سامنے آ، کہ مرا عشق ہے منطق میں اسیر
آگ بھڑکی تو یہ پتھر بھی پگھل جائے گا
دل کو میں منتظرِ ابرِ کرم کیوں رکھوں
پھول ہے، قطرۂ شبنم سے بہل جائے گا
موسمِ گل اگر اس حال میں آیا بھی تو کیا
خونِ گل، چہرۂ گلزار پہ مل جائے گا
وقت کے پاؤں کی زنجیر ہے رفتار، ندیم
ہم جو ٹھہرے تو اُفق دور نکل جائے گا

("دشتِ وفا") اکتوبر 1965

○

سونی سونی گلیاں ہیں، اجڑی اجڑی چوپالیں
جیسے کوئی آدم خور، پھر گیا ہو گاؤں میں
جب کسان، کھیتوں پر دوپہر میں جلتے ہیں
لوٹتے ہیں سگ زادے، کیکروں کی چھاؤں میں
تم ہمارے بھائی ہو—بس ذرا سی دوری ہے
ہم فصیل کے باہر، تم محل سراؤں میں
خون رسنے لگتا ہے، ان کے دامنوں سے بھی
زخم چھپ نہیں سکتے، ریشمی رداؤں میں
دوستی کے پردے میں، دشمنی ہوئی اتنی
رہ گئے فقط دشمن، اپنے آشناؤں میں
امن کا خدا حافظ — جب کہ نخل زیتوں کا
شاخ شاخ بٹتا ہے، بھوکی فاختاؤں میں
ایک بے گنہ کا خوں، غم بٹا گیا کتنے!
بٹ گیا ہے اک بیٹا، بے شمار ماؤں میں
بے وقار آزادی، ہم غریب ملکوں کی
تاج سر پہ رکھا ہے، بیڑیاں ہیں پاؤں میں
خاک سے جدا ہو کر، اپنا ورن کھو بیٹھا
آدمی معلق سا رہ گیا خلاؤں میں
اب ندیم منزل کو ریزہ ریزہ چنتا ہے
گھر گیا تھا بے چارہ، کتنے رہنماؤں میں

("دوام") جنوری 1976

○

آپ ہی اپنا تماشائی ہوں
میں مبصر ہوں کہ سودائی ہوں
نہ کوئی چاند، نہ تارا، نہ امید
میں مجسم شبِ تنہائی ہوں
ہے سفر شرط مجھے پانے کی
میں کہ اک لالۂ صحرائی ہوں
سیدھے رستے پہ چلوں تو کیسے
بھولی بھٹکی ہوئی دانائی ہوں
مجھ سے خود کو نہ سمیٹا جائے
اور خدائی کا تمنائی ہوں
میرے ماضی کے اندھیروں پہ نہ جا
صبحِ آئندہ کی رعنائی ہوں
کاش یہ جانتا دشمن میرا
میں ہر انسان کا شیدائی ہوں
میں پہاڑوں کی خموشی ہوں ندیم
اور میں بحر کی گویائی ہوں

(اپریل 1989)

○

احمد ندیم قاسمی

قطعات

کنجِ زنداں میں پڑا سوچتا ہوں
کتنا دلچسپ نظارا ہوگا
یہ سلاخوں میں چمکتا ہوا چاند
تیرے آنگن میں بھی نکلا ہوگا

(دسمبر1958)

○

حد سے جب بڑھنے لگا تلخیِ حالات کا زہر
ذائقے کو تری شیریں دہنی یاد آئی
جب بھی میں راہ سے بھٹکا، ترا پیکر چمکا
جب بھی رات آئی، تری سیم تنی یاد آئی

○

داورِ حشر مجھے تیری قسم
عمر بھر میں نے عبادت کی ہے
تو مرا نامۂ اعمال تو دیکھ
میں نے انساں سے محبت کی ہے

(جنوری1959)

○

چاند نکلا ہے سرِ بام لبِ بام آؤ
دل میں اندیشۂ انجام نہ آنے پائے
کچھ اس انداز سے اترو مری تنہائی میں
کھوج میں گردشِ ایام نہ آنے پائے

○

اس درد کا بھی کریں مداوا
اس دَور کے چارہ گر کہاں ہیں
آنسو مرے دل میں گر رہے ہیں
نالے مرے خون میں رواں ہیں

(''دشتِ وفا'' سے ماخوذ)

□□□

جدیدیت کی فلسفیانہ اساس

مصنف: شمیم حنفی

پروفیسر شمیم حنفی کی اس کتاب میں جو جدیدیت اور نئے فکری اور فلسفیانہ میلانات کے سیاق میں حوالے کی حیثیت رکھتی ہے، جدیدیت اور مارکسیت سمیت ادب، زبان اور آرٹ سے تعلق رکھنے والے تمام اہم مکاتبِ فکر اور تصورات سے بحث کی گئی ہے۔ ادب میں قدیم و جدید کی کشمکش اور نئے طرزِ احساس و اظہار کے حوالے سے ایک اہم کتاب۔

صفحات: 292، قیمت: /114 روپے

نئی شعری روایت

مصنف: شمیم حنفی

اردو میں جب جدیدیت کے رجحان نے زور پکڑا اور اس وقت کے نئے لکھنے والوں میں اسے غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی تو اس کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا گیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے موافق اور مخالف دونوں طرح کی آرا کو سامنے رکھ کر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

صفحات، 239، قیمت: -/96 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45%اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

احمد ندیم قاسمی

افسانہ

بین

''بین'' احمد ندیم قاسمی کا ایک ایسا افسانہ ہے جسے بلا جھجک اردو کے بہترین افسانوں کے کڑے سے کڑے انتخاب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ قاسمی صاحب کی افسانہ نگاری کا آغاز منٹو، بیدی، کرشن، عصمت اور غلام عباس کے ساتھ ہوا اور آخری عمر تک ان کے یہاں تازگی، توانائی اور تنوع کا وہی وفور قائم رہا۔ رئیس خانہ، سناٹا، پہاڑوں کی برف، پرمیشر سنگھ، گنڈاسا، کفن دفن، آتش گل، الحمد لله، لارنس آف تھلیسیا، سفید گھوڑا، کپاس کا پھول، جوتا اور بین ان کے اس افسانوی سفر کے وہ درخشندہ سنگ میل ہیں جن کے بغیر اردو افسانے کا تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔

ہمارے دیہات میں پیروں، فقیروں اور مزاروں کی روایت کتنی مضبوط، گہری اور انسان کش ہے اس کا اندازہ شہروں کی نسبتاً تعلیم یافتہ آزاد خیال اور تیز رفتار زندگی میں شاید ممکن ہی نہیں، مزاروں پر بیٹھے ہوئے مجاور اور سائیں مذہب اور ضعیف لاعتقادی کے حوالے سے عوام کا جس جس طرح سے استحصال کرتے ہیں اس کے مقابلے میں جاگیر دار کا روایتی ظلم اور کمی کمین کو ڈھور ڈنگر سمجھنے والا رویہ بھی ہیچ نظر آنے لگتا ہے، مزارعوں کے گھروں میں جوان ہونے والی لڑکیاں آئے دن ان کی ہوس کی بھینٹ چڑھتی ہیں مگر لٹنے والی اُف تک نہیں کر سکتیں، صاحبِ مزار کی غیبی بھسم کر دینے والی قوت کا خوف، مجاور کی طاقت اور دہشت اور اپنے اعتقادات کی دلدل میں دھنسے ہوئے یہ افتادگان خاک کرچی کرچی ہو کر بکھر جاتے ہیں مگر ان کرچیوں سے کسی ظالم کے ہاتھ پر خراش تک نہیں آتی

بس کچھ ایسا ہی موسم تھا میری بچی، جب تم سولہ سترہ سال پہلے میری گود میں آئی تھیں۔ بکائن کے اودے اودے پھول اسی طرح مہک رہے تھے اور بیریوں پر گلبریاں چوٹی تک اسی طرح بھاگی پھرتی تھیں اور ایسی ہوا چل رہی تھی جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی۔ جب تم میری گود میں آئی تھیں تو دیے کی کالی پیلی روشنی میں اونگھتا ہوا کوٹھا چمکنے سا لگا تھا اور دایہ نے کہا تھا کہ ہائے ری، اس چھوکری کے تو انگ انگ میں جگنو ٹکے ہوئے ہیں! اس وقت میں نے بھی درد کے خمار میں اپنے جسم کے اس ٹکڑے کو دیکھا تھا اور مجھے تو یاد نہیں پر دایہ نے بعد میں مجھے بتایا تھا کہ میں مسکرا کر تمھارے چہرے کی دمک میں اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو یوں دیکھنے لگی تھی جیسے کوئی خط پڑھتا ہے۔

اگلی رات جب تمھارے بابا نے موقع پا کر تمھیں دیکھا تھا تو اداس ہو گیا تھا اور میں نے کہا تھا: ''تم تو کہتے تھے بیٹا ہو یا بیٹی سب خدا کی دین ہے، پھر اب کیوں منہ لٹکا لیا ہے۔'' اور اس نے کہا تھا: ''تو نہیں جانتی نا بھولی عورت، تو ماں ہے نا۔ تو کیسے جانے کہ خدا اتنی خوب صورت لڑکیاں صرف ایسے بندوں کو دیتا ہے جن سے وہ بہت خفا ہوتا ہے۔'' اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ میں تمھارے بابا کی آنکھیں اس کی کھوپڑی میں سے نکال کر باداموں کی طرح توڑ دوں کیوں کہ میری جان، وہ تو تمھیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے چڑیا سانپ کو دیکھتی ہے، وہ تمھاری خوب صورتی دیکھ کر ڈر گیا تھا اور پھر اس نے اپنی عمر کے سولہ سترہ سال تم سے ڈرتے ڈرتے گزار دیے۔ وہ اب بھی ڈرا اور سہما ہوا، باہر گلی میں بچھی ہوئی چٹائیوں پر لوگوں میں گھرا بیٹھا ہے اور آسمانوں کو یوں دیکھ رہا ہے جیسے کوئی اس کی طرف آ رہا ہے۔

تم مجھ پر تو نہیں گئی تھیں میری بچی، میں تو گاؤں کی ایک عام لڑکی تھی۔ میرا ناک نقشہ بالکل سیدھا سادا تھا۔ ہاں تم اپنے بابا پر گئی تھیں جو بہت خوب صورت تھا۔ وہ تو اب بھی خوب صورت ہے پر اب اس کی خوب صورتی سولہ سترہ سال کی گرد سے اَٹ گئی ہے۔ اب بھی اس کی بڑی بڑی چیردیں بادامی آنکھیں ہیں اور اب بھی اس کے چہرے اور مونچھوں کے رنگ میں سونا ہے پر جب تم پیدا ہوئی تھیں نا تو وہ بالکل مورت تھا۔ تم آئیں تو وہ ڈر گیا تھا مگر اس ڈر نے اس کی شکل نہیں بدلی۔ بس ذرا سی بجھا دی۔ تمھارے آنے کے بعد میں نے اس کے موتیوں کے سے دانت بہت کم دیکھے۔ اس کے پنکھڑی ہونٹ ہمیشہ یوں بھنچے رہے جیسے کھلے تو کچھ ہو جائے گا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب وہ آیا اور اس نے تمھیں دیکھا تو مجھے ایسا لگا جیسے کسی بہت بڑے محل کی بنیادیں بیٹھ رہی ہیں۔ وہ یہاں کھڑے کھڑے ہی ایک دم اندر سے بوڑھا ہو گیا۔ جب وہ پلٹا تو میں ڈری کہ وہ گلی تک پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیر ہو جائے گا مگر ابھی ابھی میں نے دیوار پر سے جھانکا ہے تو وہ گلی میں بیٹھا ہے اور جمع ہوتے ہوئے لوگوں کو یوں ڈر ڈر کر، چونک چونک کر دیکھ رہا ہے جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔

تم جب تین چار سال کی ہو کر بھاگنے دوڑنے لگیں تو دیکھنے والوں کو

یقین نہیں آتا تھا کہ مٹی کا بنا ہوا انسان اتنا خوب صورت بھی ہو سکتا ہے۔ ایک بار تم گر پڑیں اور تمھارے ماتھے پر چوٹ آئی تو میں تو روتے روتے نڈھال ہو گئی پر تمھارے بابا نے چہک کر کہا تھا "خدا جو بھی کرتا ہے ٹھیک کرتا ہے۔ ہماری رانو بٹی کے ماتھے پر چوٹ کے نشان نے اس کی خوب صورتی کو داغ دار کر دیا ہے۔" پر خدا کو تو کچھ اور منظور تھا۔ چوٹ کا نشان تو باقی رہ گیا مگر یہ نشان بالکل نئے نئے چاند کا سا تھا۔ لال لال سا بھی اور سنہرا سنہرا سا بھی، جو اَب میری جان، پیلا پیلا سا لگ رہا ہے۔

پھر جب تم پانچ سال کی ہوئیں تو میں نے قرآن شریف پڑھانے کے لیے تمھیں بی بی جی کے پاس بٹھا دیا۔ تب پتا چلا کہ تمھاری آواز بھی تمھاری طرح خوب صورت ہے۔ بی بی جی کے گھر کی دیواروں کے اندر سے قرآن شریف پڑھنے والی بچیوں کی آوازیں آتی تھیں تو ان میں سے میری رانو بٹی کی آواز صاف پہچانی جاتی تھی۔ تمھاری آواز میں چاندی کی کٹوریاں بجتی تھیں۔ ایسی کھنک کہ تم چپ بھی ہو جاتی تھیں تو جب بھی چار طرف سے جھنکاری اٹھتی رہتی تھی۔ پھر یوں ہوا کہ پہلے تم آیت پڑھتی تھیں اور تمھارے بعد تمھاری ہم سبقوں کی آوازیں آتی تھیں۔ یوں جب تم اکیلی پڑھ رہی ہوتی تھیں تو گلی میں سے گزرنے والوں کے قدم رک جاتے تھے اور چڑیوں کے غول منڈیروں پر اتر آتے تھے۔ ایک بار مزار سائیں دولے شاہ جی کے مجاور سائیں حضرت شاہ ادھر سے گزرے تھے اور تمھاری آواز سن کر انھوں نے کہا تھا "یہ کون لڑکی ہے جس کی آواز میں ہم فرشتوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سن رہے ہیں۔" اور جب تمھیں معلوم ہوا تھا کہ سائیں حضرت شاہ نے تمھارے بارے میں یہ کہا ہے تو تم اتنی خوش ہوئی تھیں کہ رونے لگی تھیں۔

تب یوں ہوا کہ عورتیں پانی سے بھرے ہوئے برتن لاتیں اور تمھاری تلاوت ختم ہونے کا انتظار کرتی رہتیں۔ تم قرآن پاک بند کر کے اٹھتیں اور "طفیل سائیں دولے شاہ جی" کہتی ہوئی ان برتنوں پر 'چھوہ' کرتیں اور عورتیں یہ پانی اپنے عزیزوں کو پلاتیں تو بیمار اچھے ہو جاتے، برے نیک ہو جاتے، بے نمازی نمازی ہو جاتے۔

ان دنوں مجھے یوں لگنے لگا جیسے تم نور کی بنی ہوئی تو خیر ہمیشہ سے ہو پر اب تم بی بی جی کے ہاں سے واپس گھر میں آتیں تو تمھارے چہرے پر میری نظریں نہ جم پاتیں، جیسے سورج پر نظر نہیں جمتی۔

خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تم سائیں دولے شاہ جی کا نام جپتی رہتی تھیں۔ اسی لیے تو تمھارا بابا ایک بار تمھیں سائیں دولے شاہ جی کے مزار پر سلام بھی کرا لایا تھا۔

قرآن شریف تم نے اتنا پڑھا میرے جگر کی ٹکڑی، کہ اب بھی جب چارا طرف سناٹا اور صرف ادھر ادھر سے سسکی کی آواز آتی ہے، میں تمھارے آس پاس، تمھاری ہی آواز میں قرآن شریف کی تلاوت سن رہی ہوں۔ تمھارے ہونٹ تو نہیں ہل رہے، پر میں اپنے دودھ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ آواز تمھاری ہے۔ زمین پر ایسی نورانی آواز میری رانوں کے سوا اور کس کی ہو سکتی ہے۔

ایک دن جب تمھارے چاچا دین محمد کی بیوی اپنے بیٹے کے لیے تمھارا رشتہ پوچھنے آئی تو تب مجھے معلوم ہوا کہ تم شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہو۔ مائیں تو بٹی کے سر پر چنی لیتے ہی سمجھ جاتی ہیں کہ وقت آ رہا ہے پر تمھارے بارے میں تو میں سوچ ہی نہ سکی۔ تم نے سوچنے کی مہلت ہی نہ دی۔ میں نے تمھارے بابا سے اپنی اس بے خبری کی بات کی تو وہ بولا "تو تو سدا کی بے خبر ہے پر میں ایسا بے خبر نہیں ہوں۔ بس یہ ہے کہ مجھے لڑکی سے ڈر لگتا ہے اس سے بھی تو بات کر۔ اس نے تو جیسے اپنا سب کچھ مولا کی راہ میں تج دیا ہے۔"

تب پہلی بار مجھے بھی تم سے خوف آیا۔ میں نے سوچا اگر میں نے تم سے رشتے کی بات کی تو کہیں تم جلال میں نہ آ جاؤ، مگر پھر اسی شام کو سائیں حضرت شاہ کا ایک خادم آیا اور اس نے بتایا کہ کل سے سائیں دولے شاہ کا عرس ہے جو تین دن تک چلے گا اور سائیں حضرت شاہ نے خواب میں سائیں دولے شاہ جی کو دیکھا ہے اور یہ فرماتے سنا ہے کہ میری چیلی رانو کو بلا کر تین دن تک اس سے میرے مزار پر قرآن شریف کی تلاوت کراؤ ورنہ سب کو بھسم کر دوں گا۔ تم جانتی تھیں بٹی کہ سائیں دولے شاہ جی بڑے جلال والے سائیں تھے۔ زندگی میں جس نے بھی ان کے خلاف کوئی بات کی اسے بس ایک نظر بھر کر دیکھا اور راکھ کر ڈالا۔ مرنے کے بعد بھی ان کی درگاہ میں یا اس کے آس پاس کوئی برا کام یا بری بات ہو جائے تو ان کا مزار شریف سرہانے کی طرف سے کھل جاتا ہے اور اس میں سے ان کا دستِ مبارک بلند ہوتا ہے۔ برا کام یا بری بات کرنے والا جہاں بھی ہو کھنچا چلا آتا ہے۔ اپنی گردن سائیں جی کے دستِ مبارک میں دے دیتا ہے اور پھر وہیں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ سائیں جی کا دستِ مبارک واپس مزار شریف میں چلا جاتا ہے اور مزار شریف کی درازیں یوں جاتی ہیں جیسے کبھی کھلی ہی نہیں تھیں۔

کس کی مجال تھی کہ سائیں دولے شاہ جی کا حکم ٹالتا۔ دوسرے دن صبح کو ہم تینوں ایک اونٹ پر کجاوے میں بیٹھے تھے اور درگاہ سائیں دولے شاہ جی کی طرف جا رہے تھے۔ میں کجاوے کے ایک طرف تھی اور تم میری جان، دوسری طرف تھیں اور درمیان میں اونٹ کے پالان پر تمھارا بابا بیٹھا تھا۔ اونٹ جونہی اٹھا تھا اور چلنے لگا تھا تو تم نے قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی تھی اور میری پاک اور نیک بچی، میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ ہمارا اونٹ جہاں سے بھی گزرتا تھا، لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے تھے۔ وہ ہمارے ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور رو رہے تھے اور سبحان اللہ کہہ رہے تھے اور کجاوے کے اوپر چڑیوں اور ابابیلوں اور کبوتروں کے جھنڈ کے جھنڈ آتے تھے

اور غوطہ لگا کر جیسے میری بچی کی آواز کا شربت پی کر ناچتے تیرتے ہوئے دور نکل جاتے تھے اور میں سوچتی تھی کہ یہ ہم گنہگاروں کی کس نیکی کا بدلہ ہے کہ خدا نے ہمیں ایسی بیٹی بخشی ہے جو زمین پر قرآن شریف کی تلاوت کرتی ہے تو اس کی آواز آسمان تک جاتی ہے۔ آسمان کا خیال مجھے یوں آیا تھا کہ ایک بار تمھارے بابا نے پالان پر سے جھک کر کے میرے کان میں ہولے سے کہا ''اوپر دیکھو، یہ کیسے نورانی پرندے ہیں جو ہمارے ساتھ ساتھ اڑ رہے ہیں۔ میں نے ان علاقوں میں ایسا پرندہ کبھی نہیں دیکھا کہ ان کے پروں میں ستارے چمکتے ہوں۔ یہ تو آسمانوں سے اتر کر آنے والے فرشتے معلوم ہوتے ہیں'' اور میری آنکھوں کا نور بچی، میں تمھاری جاہل ماں بھی قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں کہ وہ فرشتے ہی تھے۔ کچھ ایسے جیسے ننھے منے بچوں کے پر لگ گئے ہوں اور وہ ہوا میں ہمکتے پھرتے ہوں۔ وہ میری پہنچی ہوئی بیٹی سے تلاوت سننے آئے تھے۔

پھر جب درگاہ سائیں دولھے شاہ جی کے پاس ہمارا اونٹ بیٹھا تھا تو جیسے تم بھول گئی تھیں کہ تمھارے ساتھ تمھارے ماں باپ بھی ہیں تم مزار شریف کی طرف یوں کھنچی چلی گئی تھیں جیسے سائیں دولھے شاہ جی تمھاری انگلی پکڑ کر تمھیں اپنے گھر لیے جا رہے ہوں۔ مزار شریف کو بوسہ دے کر اور اس کے ایک طرف بیٹھ کر تم نے قرآن شریف کی تلاوت کر دی تھی اور تمھاری آواز کی مٹھاس چکھنے کے لیے عرس پر آنے والے لوگ مزار شریف پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ہم دونوں نے مزار شریف کو اپنی پوروں سے چھوا اور پھر اپنی پوریں چوم لیں۔ پھر ہم سائیں حضرت شاہ کی خدمت میں ان کے زانوؤں کو چھونے اور دستِ مبارک کو چومنے پہنچے تھے اور انھوں نے فرمایا تھا ''اپنی بیٹی کو سائیں جی کے قدموں میں بٹھا کر تم نے اپنے اگلے پچھلے گناہ معاف کرا لیے ہیں۔ تم انشاء اللہ جنتی ہو۔'' یہ سن کر خوشی سے ہماری سانسیں پھول گئی تھیں۔ پھر میں نے اندر جا کر بی بیوں کو سلام کیا تھا اور تمھیں ـــ میری جان ـــ سائیں دولھے شاہ جی اور سائیں حضرت شاہ اور ان کے گھرانے کی بی بیوں کی امانت میں دے کر ہم دونوں یہ کہہ کر واپس گاؤں آ گئے تھے کہ عرس کے تین دن گزرنے کے بعد اگلے روز ہم اپنی اس نعمت کو لینے حاضر ہو جائیں گے جو خدا نے اور اس کے حبیب پاک نے ہم غریبوں، گنہگاروں کو ہماری کسی سیدھی سادی نیکی سے خوش ہو کر بخشی ہے۔

اے میری بچی، اے میری جگر کی ٹکڑی، اے میری صاف ستھری رانو بچی! پھر جب تین دنوں کے بعد ہم دونوں سائیں دولھے شاہ جی کے مزار شریف پر گئے تھے تو تم وہیں بیٹھی تھیں جہاں ہم تمھیں بٹھا گئے تھے، مگر کیا یہ تم ہی تھیں، تمھاری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں، تمھارے ہونٹوں پر جمے ہوئے خون کی پپڑیاں تھیں، تمھارے بال الجھ رہے تھے۔ چادر تمھارے سر سے اتر گئی تھی مگر اپنے بابا کو دیکھ کر بھی تمھیں اپنا سر ڈھانپنے کا خیال نہیں آیا تھا۔ تمھارا رنگ مٹی مٹی ہو رہا تھا اور ہمیں دیکھتے ہی تم چلا پڑی تھیں ''مجھ سے دور رہو بابا، میرے پاس نہ آنا اماں۔ میں اب یہیں رہوں گی۔ میں اس وقت تک یہیں رہوں گی جب تک سائیں دولھا شاہ جی کا مزار شریف نہیں کھلتا اور اس میں سے ان کا دستِ مبارک نہیں نکلتا۔ جب تک فیصلہ نہیں ہوتا میں یہیں رہوں گی۔ جب تک انصاف نہیں ہوگا میں یہیں رہوں گی اور مزار شریف کھلے گا۔ آج نہیں تو کل کھلے گا۔ ایک مہینہ بعد، ایک سال بعد، دو سال بعد سہی، پر مزار شریف ضرور کھلے گا اور دستِ مبارک ضرور نکلے گا۔ تب میں خود ہی اپنے بابا اور اپنی اماں کے قدموں میں چلی آؤں گی اور ساری عمر ان کی جوتیاں سیدھی کروں گی اور ان کے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔ پر اب میں نہیں آؤں گی، اب میں نہیں آ سکتی۔ میں بندھ گئی ہوں۔ میں مر گئی ہوں۔'' پھر تمھیں ایک دم بہت سارا رونا آ گیا تھا مگر تم نے ایک دم اپنے آنسو روک لیے تھے اور تم بھیگی ہوئی آواز میں تلاوت کرنے لگی تھیں۔ آس پاس کھڑے ہوئے بیسیوں لوگ ہمارے ساتھ زار زار رونے لگے تھے اور کہنے لگے تھے ''اثر ہو گیا ہے، دن رات مزار شریف پر رہنے سے اس پر اثر ہو گیا ہے۔''

تمھارے بابا نے فریاد کی تھی۔ اثر ہو گیا ہے؟ دن رات قرآن شریف کی تلاوت کرنے والی لڑکی پر کوئی اثر کیسے ہو سکتا ہے اور اگر تم کہتے ہو کہ اثر ہو گیا ہے تو سائیں حضرت شاہ کہاں ہیں؟ وہ روتا ہوا سائیں حضرت شاہ کی طرف چل پڑا تھا اور میں بلکتی ہوئی اس کے پیچھے پیچھے تھی، مگر ہمیں خادموں نے بتایا تھا کہ سائیں جی تو عرس کے فوراً بعد ایک حجرے میں بند ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور کئی دنوں تک وظیفہ فرماتے ہیں اور کسی سے نہیں ملتے پھر میں نے اندر بی بیوں کے پاس جانا چاہا تھا مگر بڑے دروازے پر خادماؤں نے بتایا تھا کہ رانو کی حالت سے بی بیاں پہلے ہی بہت پریشان ہیں اور انھیں زیادہ پریشان کرنا گناہ ہے۔

ہم اجڑے بچھڑے ماں باپ، مزار شریف سے ایک طرف ہٹ کر بیٹھ گئے تھے اور رو رہے تھے اور لوگ ہمیں روتا دیکھ کر رو رہے تھے کہ سائیں حضرت شاہ کا خاص خادم آیا تھا اور اس نے بتایا تھا کہ سائیں جی کو بہت رانو کی اس حالت کا بڑا دکھ تھا اور انھوں نے فرمایا تھا کہ یہ لڑکی اچانک جن بھوت کے قبضے میں چلی گئی ہے اور سائیں حضرت شاہ ایک خاص وظیفہ فرما رہے ہیں کہ یہ جن اُترے تو اس امانت کو اس کے ماں باپ تک پہنچایا جائے۔ پھر حکم ہوا تھا کہ تم جاؤ اور رانو کو درگاہ شریف کی نگرانی میں رہنے دو۔

''اب تم جاؤ۔'' ہمارے سروں پر تمھاری آواز آئی تھی اور ہم نے سر اٹھا کر دیکھا تھا کہ تمھاری آنکھیں تالابوں کی طرح بھری ہوئی تھیں۔ ''اب تم جاؤ میرے بابا، جاؤ میری اماں۔ اب تم جاؤ مزار شریف ضرور کھلے گا۔ دستِ

مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہوگا۔ فیصلہ ہو جائے تو میں سیدھی تمھارے پاس پہنچوں گی۔ سائیں دولھے شاہ جی خود مجھے تمھارے پاس چھوڑ جائیں گے۔ اب تم جاؤ۔۔۔‘‘ یہ کہہ کر تم مزار شریف کی طرف پلٹ گئی تھیں اور تم چلتے ہوئے یوں ڈول رہی تھیں جیسے کٹی ہوئی پتنگ ڈولتی ہے۔

میں تم پر سے صدقے جاؤں میری بیٹی۔ ہم تمھارے ماں باپ اس کے بعد بھی بار بار تمھارے پاس پہنچے مگر اب تو تم ہمیں پہچانتی بھی نہیں تھیں۔ ہم تمھیں پکارتے تھے تو تم ہماری طرف یوں خالی خالی آنکھوں سے دیکھتی تھیں جیسے حیران ہو رہی ہو کہ یہ آواز کدھر سے آئی ہے۔ تمھارا رنگ خاکستری ہو گیا تھا۔ تمھارے ہونٹ اکڑ کر پھٹ گئے تھے۔ تمھارے بالوں میں گرد تھا اور تنکے تھے اور ٹوٹے ہوئے خشک پتے تھے۔ ایک بار جب ہم تمھارے لیے کپڑوں کا نیا جوڑا لے کر گئے اور ہم نے یہ کپڑے تمھارے سامنے رکھ دیے تو تم یہ کپڑے ہاتھ میں لے کر اٹھیں اور ایک طرف چل پڑیں۔ تمھارا ایک بھی قدم سیدھا نہیں اٹھتا تھا۔ پھر تم غائب ہو گئی تھیں اور ہم خوش ہوئے تھے کہ تم کہیں کپڑے بدلنے گئی ہو، مگر پھر ایک دم ایک طرف سے شور اٹھا تھا۔ تم اسی رفتار سے واپس آ رہی تھیں اور تمھارے پیچھے درگاہ شریف کے چند خادم تھے جنھوں نے بتایا تھا کہ تم نے نئے کپڑوں کا یہ جوڑا اور درگاہ شریف کے لنگر کی دیگ کے نیچے بھڑکتی آگ میں جھونک دیا تھا۔

تلاوت تو تم اب بھی کر رہی تھیں مگر آواز میں چاندی کی کٹوریاں نہیں بجتی تھیں۔ پھر تم پڑھتے پڑھتے مزار شریف کے سرہانے کی طرف جھک جاتی تھیں جیسے کوئی جھری، کوئی دراڑ ڈھونڈنے کی کوشش میں ہو پھر تم ٹوٹ کر رو دیتی تھیں اور تلاوت کو روک کر ہولے ہولے جیسے خود کو سمجھاتی تھیں۔۔۔ مزار شریف ضرور کھلے گا۔ دستِ مبارک ضرور نکلے گا۔ فیصلہ ضرور ہوگا۔ انصاف ضرور ہوگا۔ پھر تم آنکھیں بند کر لیتی تھیں اور تلاوت میں مصروف ہو جاتی تھیں۔

ایک بار ہم سائیں حضرت شاہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے تھے اور عرض کیا تھا کہ جن بھوت کلامِ پاک پڑھنے والوں کے پاس بھی نہیں پھٹکتے۔ دور سے بیٹھے ہنستے رہتے ہیں اور جھومتے رہتے ہیں اور اگر ہماری ہیرا بیٹی پر ایسے کافر جن آ گئے ہیں جو قرآن شریف کی تلاوت کا بھی لحاظ نہیں کرتے، تو یہ آپ کی درگاہ شریف ہی کے جن ہیں۔ آپ کے حکم سے اتر جائیں گے۔ خدا کے نام پر، رسولِ پاک کے نام پر، پیر دستگیر کے نام پر، سائیں دولھے شاہ جی کے نام پر ہمارے ساتھ مزار شریف پر چلیے اور یہ جن اتاریے اور سائیں حضرت شاہ نے فرمایا تھا کہ ہم جن تو اتار دیتے مگر تم نے ٹھیک کہا۔ یہ کوئی بڑا کافر جن ہے اور کافر جن ہمارے قبضے میں نہیں ہیں۔ ہم یہاں دعا کر رہے ہیں، تم گھر جا کر دعا کرو۔ ہمارا وظیفہ جاری رہے گا۔

جب ہم ٹوٹے پھوٹے واپس آ رہے تھے تو بی بیوں کی ایک بوڑھی خادمہ نے مجھے ایک طرف لے جا کر بتایا تھا کہ عرس کے تیسرے دن سائیں حضرت شاہ مزار کی طرف آئے تھے تو تمھاری بدنصیب بیٹی نے مزار شریف پر سے گول گول لہریے پتھر اٹھا کر جھولی میں بھر لیے تھے اور چیخ چیخ کر کہا تھا کہ سائیں! مزار شریف سے دستِ مبارک تو جب نکلے گا، نکلے گا اگر تم ایک قدم بھی آگے بڑھے تو میں سائیں دولھے شاہ جی کے دیے ہوئے ان پتھروں سے تمھارا ناس کر دوں گی۔ خادم تمھاری بیٹی کو پکڑ کر مارنے پیٹنے کے لیے آگے بڑھے تھے تو سائیں جی نے انھیں روک کر کہا تھا کہ نادانو یہ لڑکی نہیں بول رہی ہے اس کے اندر کا کافر جن بول رہا ہے۔ جب تک یہ مزار شریف پر قابض ہے ہمیں اور ہمارے خاندان کے کسی مرد عورت کو ادھر نہیں آنا چاہیے ورنہ کیا خبر یہ جن کیا کر بیٹھے۔

پھر رات درگاہ شریف کا ایک خادم آیا کہ تمھاری بیٹی تمھیں بلا رہی ہے۔ ہم راتوں رات کرتے پڑتے وہاں پہنچے تو تم مزار شریف کی پائنتی لیٹی ہوئی تھیں۔ چراغ کی روشنی میں ہم نے دیکھا کہ تمھاری نظر ٹک گئی تھیں اور تمھارے ہونٹ ذرا ذرا سے ہل رہے تھے۔ ظاہر ہے تم اس وقت بھی تلاوت ہی کر رہی تھیں۔ پھر جب میں نے تمھارا سر اپنی گود میں رکھا اور تمھارے بابا نے تمھارا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر رونا شروع کر دیا تو نہایت ہی کمزور آواز میں تم نے کہا تھا ’’میری اماں، میرے ابا کون جانے مزار شریف کیوں نہیں کھلا۔ انصاف تو یہیں ہوا پر چلو فیصلہ تو ہو گیا۔ چلو میں ہی گنہگار سہی۔ سائیں دولھے شاہ جی، آپ نے تو بڑا انتظار کرایا۔ اب قیامت کے دن جب ہم سب خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔۔۔ جب ہم خدا کے سامنے پیش ہوں گے۔۔۔ خدا کے سامنے۔۔۔ خدا۔۔۔‘‘ اس کے بعد تم چپ ہو گئی تھیں اور تب سے چپ ہو۔

پھر ہم تمھیں یہاں گھر میں اٹھا لائے اور جب ابھی ابھی سویرے سائیں حضرت شاہ کا خاص خادم سائیں جی کی طرف سے تمھارے لیے کفن لایا تو تم پر سے اترا ہوا جن جیسے تمھارے بابا پر آ گیا۔۔۔ اس نے کفن ہاتھ میں لیا اور اسے اس چولھے میں جھونک دیا جس پر تمھیں غسل دینے کے لیے پانی گرم کیا جا رہا تھا۔

اب میرے جگر کی ٹکڑی، میرے نیک اور پاک، میری صاف اور ستھری رانو بیٹی! آؤ میں تمھارے ماتھے کے بجھے ہوئے چاند کو چوم لوں۔ دیکھو کہ بکائن کے اودے اودے پھول مہک رہے ہیں اور بیریوں پر گلہریاں تنے سے چوٹی تک بھاگی پھر رہی ہیں اور ایسی ہوا چل رہی ہے جیسے صدیوں کے سوکھے کواڑوں سے بھی کونپلیں پھوٹ نکلیں گی اور چار طرف تمھاری تلاوت کی گونج ہے اور سائیں حضرت شاہ کے بھیجے ہوئے کفن کے جلنے کی بو اب تک سارے میں پھیل رہی ہے اور میرے اندر اتنا بہت سا درد جمع ہو گیا ہے جیسے تمھیں جنم دیتے وقت جمع ہوا تھا۔

□□□

احمد ندیم قاسمی

کچھ لوک فن کے بارے میں

کرۂ ارض پر کسی ایسی قوم، قبیلے یا گروہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا جو لوک کہانیوں، لوک گیتوں، لوک ناچوں، لوک لطیفوں اور لوک پہیلیوں سے محروم ہو۔ تہذیب کے جدید معنوں کے مطابق بھی کوئی قوم بے حد ترقی یافتہ ہو یا بہت پس ماندہ، اس کی معیشت صنعتی ہو یا قبائلی، لوک فن بہرحال اس کے کلچر کا ایک ناگزیر حصہ ہوتے ہیں۔ بس اتنا فرق ہے کہ بے حد صنعتی قوموں میں لوک فن آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اخباروں، رسالوں، کتابوں، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ہوائی سفر نے گروہی انفرادیتوں کو ختم کر کے انسانی ذہن کے لیے ایک ہی سانچا گھڑ لینے کا رجحان پیدا کر دیا ہے اور یوں وہ لوک فن مر رہا ہے جو انسانی ذہن کی تنوع پسندی کی پیداوار ہے۔ یوں تو پوری دنیا کے مقدر میں آخر کار صنعتی ہونا لکھا ہے اور اس طرح لوک فن کا مستقبل خاصا تاریک نظر آنے لگا ہے، لیکن وہ قومیں جو بیک وقت زرعی اور صنعتی معیشت میں سے گزر رہی ہیں انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں لوک فن کے زوال سے سبق حاصل کر سکتی ہیں اور ایسے حالات پیدا کر سکتی ہیں کہ اگر لوک فن میں نئے نئے اضافے نہیں ہو سکتے تو کم سے کم لوک فن کی ان خصوصیات کو زوال نہ آئے جو ان کے ہاں آج بھی زندہ ہیں۔

لوک فن اس شعر و ادب اور رقص و موسیقی کا نام ہے جسے کتابی فن کے مقابلے میں زبانی فن، کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ لائبریریوں کی بجائے لوگوں کے سینوں میں محفوظ ہوتا ہے۔ ہر نسل یہ فن دوسری نسل کو منتقل کرتی چلی آتی ہے۔ اس سلسلۂ عمل میں، اس میں اضافے بھی ہوتے رہتے ہیں اور تبدیلیاں بھی۔ یہ اضافے اور تبدیلیاں یوں رونما ہوتی ہیں کہ نئے حالات، نئے واقعات نئی مسرتوں اور نئی محرومیوں کے زیر اثر لوگ اظہار جذبات کی نئی راہیں تلاش کر لیتے ہیں۔ یا پھر کسی گیت یا کہانی کا کوئی حصہ نئے ذہنوں کو بے رس محسوس ہوتا ہے تو کوئی اس حصے کو نظر انداز کر کے اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر دیتا ہے اور یوں ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو ملا دیتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی پرانی لوک کہانی کو لیجیے جسے کسی کتاب میں محفوظ کر لیا گیا ہو۔ پھر اس کہانی کا مقابلہ اسی کہانی کی مروجہ صورت سے کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اب اس کہانی میں بس اور ریل بھی گھس آئی ہے اور اب شہزادے، دیوؤں کے چنگل میں پھنس کر اندھیرے غاروں میں پڑے نہیں رہ جاتے بلکہ اب وہ سڑکوں پر روڑی کوٹتے ہیں اور ریلوے اسٹیشنوں پر قلیوں کا کام کرتے ہیں اور شہزادیاں ان کے انتظار میں ٹرانزسٹر ریڈیو سنتی ہیں۔ چند مہینے پہلے میں نے اپنے گاؤں کی چوپال پر ایک پیشہ ور داستان گو سے ایک لوک کہانی سنی جس میں شہزادہ سات سمندروں کے سفر کی شرط پوری کرنے کے لیے لاہور پہنچ کر ہوائی جہاز میں بیٹھ جاتا ہے اور اسے خود ہی سمندروں کی طرف اڑا لے جاتا ہے۔ لوک فن میں یہ اضافے اور تبدیلیاں ناگزیر ہیں مگر جہاں تک اس کی روح کا تعلق ہے وہ ان اضافوں کے باوجود قائم رہتی ہے اس لیے کہ نامعلوم کو معلوم کرنے کا جذبہ، ظلم کو مغلوب کرنے کا جذبہ، آلامِ روزگار سے قطع نظر کر کے زندگی اور اس کے مظاہر سے مسرتیں اخذ کرنے کا جذبہ، کارخانۂ قدرت کے نظم اور بعض اوقات غیظ و غضب پر حیران رہ جانے کا جذبہ اور پھر اپنے عقائد کو محفوظ رکھنے کے لیے قدرت کی زیادتیوں کے جواز پیدا کرنے کا جذبہ انسان سے چھینا نہیں جا سکتا اور لوک فن کی بنیاد انھی جذبوں اور ان جیسے دوسرے جذبوں پر ہوتی ہے۔

کسی قوم کا لوک فن اس قوم کی تہذیب اور ثقافت بلکہ اس کی تاریخ کا بھی ایک اہم حصہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کسی شخص نے ملک کے طول و عرض میں بکھرے ہوئے ان خزانوں کی طرف سنجیدگی سے کبھی توجہ نہیں دی ورنہ آج بھی ہمارے دور دراز کے علاقوں میں ایسے گیت گائے جاتے اور ایسے قصے سنائے جاتے ہیں جن میں تغلقوں، لودھیوں اور سوریوں تک کے زمانۂ حکومت کی جھلکیاں موجود ہیں۔ مغل دورِ حکومت تو ہمارے لوک فن کے بیشتر حصے کا پس منظر ہے۔ سکھوں اور انگریزوں کا زمانۂ اقتدار بھی لوک فن کے مختلف پہلوؤں پر اثر انداز ہوا ہے۔ صرف تحریکِ خلافت کو لے لیجیے، آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کی یہ تحریک صحیح معنوں میں ایک لوک تحریک تھی اور آج بھی وہ لوگ زندہ ہیں جو اس تحریک کے زمانے میں نوجوان تھے اور جنھوں نے مولانا محمد علی جوہر کی رہنمائی میں برطانوی اقتدار سے بڑی حوصلہ مندانہ ٹکر لی تھی۔ اس تحریک نے ہمارے لوک گیتوں میں اتنا بہت سا اضافہ کیا کہ اگر صرف انھی کو یکجا کر لیا جائے تو ہمارے عوام کے جذبۂ آزادی کا ایک یادگار صحیفہ مرتب ہو سکتا ہے، مگر سوال یہ ہے کہ یہ کام کرے کون؟ اتنی فرصت کسے ہے؟ اتنا جنون کسے ہے؟ تہذیب و ثقافت کے ساتھ اتنی لگن کسے ہے؟

یہ مضمون جولائی 1966 میں لکھا گیا اور احمد ندیم قاسمی کے مجموعۂ مضامین ''تہذیب و فن'' مطبوعہ مکتبہ فنون، 4میکلوڈ روڈ، لاہور میں شامل ہے جو پہلی بار مارچ 1975 میں شائع ہوا۔

امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے دانشور شور مچا رہے ہیں کہ صنعتی ترقی ہمارے لوک فن کو چاٹے جا رہی ہے اور اس فن کا تحفظ کرو اور کتابوں اور ٹیپ ریکارڈوں اور فلموں میں محفوظ کر لو ورنہ ہم نصف صدی بعد بھول جائیں گے کہ ایک صدی پہلے ہمارے عام لوگ کیسے سوچتے تھے اور کیسے خوش ہوتے تھے اور کیسے اداس ہو جاتے تھے۔ ہمارا طرز عمل اس کے برعکس ہے۔ ہمارے ہاں لوک فن اپنے محدود حلقے میں آج بھی پر بہار ہے، مگر اب اس کے پھیلاؤ کے سامنے بند باندھے جا رہے ہیں۔ امریکہ میں لوک فن کا زوال وہاں کی تاریخ کا تقاضہ ہے۔ ہمارے ہاں اس زوال میں ہمارے بعض اوہام کی کارفرمائی ہے۔ امریکہ میں لوک فن مر رہا ہے اور ہمارے ہاں خودکشی کر رہا ہے۔

اس حقیقت سے انکار دشوار ہے کہ ہمارا کلچر بہت متنوع ہے۔ اگر اس طرز زندگی کو کلچر قرار دے دیا جائے (جیسا کہ قرار دیا جاتا ہے) جو ہمارے اوپر کے یعنی روپے پیسے والے طبقے میں رائج ہے تو پھر ہمارا کلچر یقیناً ایک رنگ (اور بے رنگ) ہے، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے اور کلچر پر کسی ایک طبقے کا اجارہ ہو ہی نہیں سکتا، سو ہمارے قومی کلچر کے مختلف اور رنگارنگ پہلو ہمارے علاقائی کلچروں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کلچروں میں لوک گیت، لوک کہانیاں، لوک ناچ، لوک لطیفے اور لوک قصے بھی مختلف ہیں اور پھر ہر واقعے، ہر رواج اور ہر رسم کے اپنے لوک گیت ہیں۔ صرف شادی بیاہ کے گیتوں کو لیجیے تو صرف پنجابی زبان بولنے والوں میں ہزار سے اوپر گیت رائج ہوں گے۔ یہی عالم پشتو، سندھی، بلوچی، براہوی اور بنگلہ زبانوں کا ہوگا۔ حد یہ ہے کہ ہمارے دیہات میں موت تک کے لوک گیت رائج ہیں اور جب جنازہ مرنے والے کے گھر سے نکلتا ہے تو گاؤں کی میراثنیں پچاس ساٹھ گز کے فاصلے تک جنازے کے پیچھے پیچھے یہ لوک مرثیے دردناک دھنوں میں گاتی ہوئی چلتی ہیں۔ یہ لوک گیت آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے ہیں آج دیہات میں بھی ریڈیو اور ریکارڈوں کی برکت سے لڑکیاں اپنے لوک گیت گانے کی بجائے شادی کے فلمی گیت گاتی ہیں اور دیہات کے پس منظر میں یہ گیت ایسے لگتے ہیں جیسے ہوائی جہاز کو بیل کھینچے لیے جا رہے ہوں! اول تو لوک فن جمع کرنے کا کسی کو شوق ہی نہیں ہے۔ لیکن جن اکا دکا افراد نے کوشش کی بھی ہے انھوں نے لوک فن جمع کرنے کی بجائے سہل انگاری کے شاہکار تخلیق کیے ہیں۔ مسٹر دیویندر ستیارتھی کے جمع کیے ہوئے بعض گیت میں نے دیکھے ہیں جن کا مروجہ گیتوں سے بہت کم تعلق ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ یہ لوک گیت شہروں میں بیٹھ کر جمع کرتے تھے اور ایک آدھ روایت کے مطابق نامکمل گیت کو خود ہی مکمل کر لیتے تھے۔ ویسے اتنا بڑا کام ایک آدمی کے کرنے کا ہے بھی نہیں اس کے لیے تو باقاعدہ ایک ادارہ ہونا چاہیے۔ مغربی ملکوں میں تو وہاں کی یونیورسٹیوں میں "فوک لور" کا باقاعدہ ایک الگ ڈیپارٹمنٹ ہوتا ہے۔ سوشلسٹ ملکوں نے بھی اپنے ہاں کے لوک فن کی حفاظت کی ہے۔ مشکل صرف ہم ایشیائیوں اور افریقیوں کے ساتھ ہے جو غلامی کے دور میں لوک فن کی اہمیت سے غافل رہے اور اب پس ماندگی کا کلنک دھونے کے لیے اپنی تہذیب و ثقافت ہی سے شرمانے لگے ہیں۔

میں نے کسی "اچھے" زمانے میں اپنے علاقے (سون سکیسر ضلع سرگودھا) کے لوک گیت جمع کرنے کی کوشش کی تھی مگر جب مہینے ڈیڑھ مہینے کے اندر میرے پاس ان گیتوں کا ایک انبار لگ گیا اور میں نے ایک بوڑھے کسان سے اس کا ذکر کیا جو آج بھی لوک گیتوں اور ناچوں کا ماہر سمجھا جاتا ہے تو وہ ہنسنے لگا اور اس کی ہنسی میں تضحیک تھی۔ اس نے کہا:

"بادشاہ ہو۔ ابھی کہاں۔ ابھی تو آپ نے رکاب میں ایک پاؤں رکھا ہے۔ ابھی تو آپ کو گھوڑے پر سوار ہونا اور ہزاروں لاکھوں کوسوں کا سفر کرنا ہے۔ آپ کے جمع کیے ہوئے گیت تو اس پہاڑ کے مقابلے میں ایک چھٹانک بھی نہیں ہوں گے جو صرف مجھے اس عمر میں بھی یاد ہیں۔ اور ابھی تو آپ نے کسی عورت سے گیتوں کا نہیں پوچھا۔ ان سے پوچھنے اور لکھنا شروع کیجیے اور یقین کیجیے کہ آپ ساری عمر لکھتے ہی رہیں گے کیونکہ عورتیں تو ان گیتوں کے سمندر ہیں۔"

محض اس مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس سمندر کو سمیٹنے کے لیے کتنے بڑے ادارے کی ضرورت ہے جو ان گیتوں اور کہانیوں اور ناچوں کی کیفیتوں اور تفصیلوں اور بھانڈوں کے موزوں کیے ہوئے شجروں اور نسلاً بعد نسل چلنے والے لطیفوں اور پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں وغیرہ کو جمع کریں، انھیں مرتب کریں، پھر ان کے پس منظر واضح کریں اور ایسا کرتے ہوئے لوک فن کے ڈھب اور ان گھڑ انداز کو بہرصورت قائم رکھیں۔ ان میں سے جو مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو آتی ہے، اسے نفاست کی "ٹائلوں" کے فرش تلے دفن نہ کر دیں۔ ناچوں اور نقلوں کی متحرک تصویریں اتار لیں اور یہ سب کام کرتے ہوئے وہ کسی قسم کے احساس برتری میں مبتلا نہ ہوں کہ وہ ان پڑھوں اور ان گھڑوں پر کوئی احسان کرنے چلے ہیں۔ ان کے اندر یہ احساس بیدار رہنا چاہیے کہ ان کی تہذیبی انفرادیت اسی لوک فن سے عبارت ہے جس میں ہمارے اہل وطن نے اپنا صدیوں کا تجربہ سمو رکھا ہے اور جس کی سب سے نمایاں خصوصیت بے ساختگی ہے، وہ بے ساختگی، جسے انسان اپنی مادی ترقی کی قربان گاہ پر بھینٹ کیے جا رہا ہے۔ وہ بے حد ساختگی جو اس "بولی" میں اپنے مکمل بھرپور پن سے موجود ہے اور اگر کوئی مصور اس کی تصویر بنا لے تو انسانی ذہن آئندہ قرنوں تک جگمگاتا، گنگناتا اور مہکتا رہے۔ وہ "بولی" یہ ہے:

گوری لاہ کے پزیباں رکھیاں
دھرتی نوں جھکل لگ گئے

□□□

فیروز عالم

سنجے گوڈبولے سے گفتگو

سنجے گوڈبولے کی پیدائش 19مئی 1964 کو پونے میں ہوئی۔ ان کی مادری زبان مرہٹی ہے لیکن وہ اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ سنجے گوڈبولے کو ادب و ثقافت کے علاوہ نوادرات و مخطوطات سے اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے دلچسپی رہی ہے۔ ان کی عمر صرف تیرہ سال کی تھی تو انہیں ایک پرانے سامان کی دکان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کیشر سرٹیفکٹ دستیاب ہوا جو انھوں نے پونے یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر ہوتے دار تک پہنچایا۔ اس واقعے سے وائس چانسلر بہت متاثر ہوئے اور یہ پیشین گوئی کی کہ مستقبل میں یہ لڑکا بڑا محقق بنے گا۔ یہ پیشین گوئی بالکل سچ ثابت ہوئی۔ سنجے قدیم ترین سکوں، مہروں، گھریلو اشیا اور اس طرح کی دوسری چیزوں کی فراہمی کے لیے بھاری سے بھاری قیمت ادا کرنے میں ذرا بھی تامّل نہیں کرتے۔

گوڈبولے صاحب نے تین مضامین میں ایم۔اے کی سند حاصل کی ہے۔ علم آثار قدیمہ میں پونے یونیورسٹی سے تواریخ اور ہندوستانیات (Indology)میں تلک یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ کی سند حاصل کی ہے۔ انھوں نے پونے یونیورسٹی سے بی۔ کام اور ایل۔ ایل۔ بی۔ کی اسناد بھی حاصل کی ہیں۔ علاوہ ازیں رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن اور رائل نیوسمنک سوسائٹی لندن سے انہیں فیلوشپ بھی تفویض کی جا چکی ہے۔ فی الوقت بھارت اتہاس سنشوشن منڈل، پونے،Indian History Congress دہلی، Epigraphical Society of India میسور، Oriental Numismatie Society لندن،Numismatie Society of India وارانسی، Patron of International Collectors Society of rare Items مہاراشٹر کے ممبر ہیں اورNumismatic Society of Maharashtra جو پونے میں ہے اس کے بانی کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔

سنجے گوڈبولے کے اب تک 500 مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اردو کے ایک اچھے غزل گو بھی ہیں۔ مختلف زبانوں میں ان کی اب تک نو(9) کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انگریزی زبان میں "Cains Collection for Beginners" مراٹھی میں "پونے کے اردو شعرا کا انتخاب" اور "شرح مرزا غالب" کے علاوہ اردو میں "پروفیسر بلبیر ورما احوال و شاعری" "دیوان میر دوم" "کالی داس گپتا: فن اور شخصیت" حیدر قریشی: فن اور شخصیت" "جانشین داغ بھائی جان عاشق" اور "غالبیات پر تین یادگار تقریریں" قابل ذکر ہیں۔ جناب سنجے گوڈبولے سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات قارئین اردو دنیا کے لیے پیش ہیں۔

سوال: آپ کی مادری زبان مراٹھی ہے، اردو سے دلچسپی کیسے پیدا ہوئی؟

جواب: مجھے بچپن ہی سے آثار قدیمہ میں دلچسپی ہے۔ میں نے آرکیولوجی میں ایم۔اے۔ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ مغلیہ عہد کی جتنی بھی چیزیں ہیں، وہ فارسی میں ہیں، اس لیے مجھے پہلے فارسی سے دلچسپی پیدا ہوئی، اس کے بعد اردو کا شوق پیدا ہوا اور میں نے باقاعدہ اردو پڑھنا اور لکھنا سیکھا۔

سوال: اپنے خاندانی پس منظر کے بارے میں کچھ بتائیے؟

جواب: میرا تعلق کوکن کے چتپاون برہمن گھرانے سے ہے۔ مہاراشٹر کے حکمراں پیشوا بھی چتپاون برہمن تھے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں ہماری قوم نے مہاراشٹر کی تاریخ میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ میرا تعلق کوکن کے ایک گاؤں پاوس ضلع رتناگیری سے ہے۔ ہمارے خاندان کا کاروبار پہلے ساہوکاری تھا۔ 1810 میں میرے اجداد کوکن سے پونہ منتقل ہوگئے۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے کتابوں کی اشاعت اور فروخت کا پیشہ اختیار کرلیا تھا۔ 1850 کے آس پاس کچھ عرصے کے لیے مراٹھی میں ایک اخبار بھی جاری کیا تھا۔ اس کا نام "ورت موذ" تھا۔ ساتھ ہی میرے دادا کے دادا نے بہار دانش عنوان سے ایک کتاب شائع کی تھی جو فارسی حکایتوں کا مراٹھی ترجمہ تھا۔ مراٹھا راج کی سرکاری زبان مراٹھی کے ساتھ فارسی بھی تھی اس لیے اس وقت اکثر خاندان کے لوگ فارسی جانتے تھے۔

میرے پردادا مہاراشٹر کے بڑے کتب فروش تھے۔ میرے دادا پہلی عالمی جنگ میں ترکستان میں تھے۔ وہ اچھی اُردو جانتے تھے۔

اسی دوران انھوں نے انگریزوں کو رضا کارانہ طور پر اُردو سکھائی تھی۔ کتب فروشی ان کا پیشہ تھا۔ میرے والد گیانیشور سیتارام گوڈبولے مہاراشٹر اسکول ٹیکسٹ بک بیورو کے تقسیم کار اور مراٹھی کتابوں کے بڑے ناشر تھے۔ ساتھ ہی ساتھ حکمت اور علم نجوم میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ کتب فروشی ہمارا خاندانی پیشہ ہے جس کو 194 سال پورے ہو رہے ہیں۔ میں بھی اسی پیشے سے منسلک ہوں۔

سوال: آپ نے تاریخ اور آثار قدیمہ کے علاوہ Indology میں بھی ایم۔اے۔ کیا ہے۔ یہ نسبتاً غیر معروف مضمون ہے۔ کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈالنا پسند کریں گے؟

جواب: یہ موضوع ''بیسویں صدی'' میں جرمن اور انگریز دانشوروں اور محققین نے پیش کیا۔ آسان زبان میں اس لفظ کا ترجمہ کیا جائے تو ''بھارتیہ وِدّیا'' ہوتا ہے۔ اس میں قدیم بھارت کی تاریخ، پرانے سکے، قدیم عمارتیں، پرانی تہذیب وتمدن، ادب، قدیم ہندوستانی لپیاں اور پرانی گپھائیں اور ہلا لیکھ شامل ہیں۔ یہ بہت دلچسپ موضوع ہے۔ یورپ میں قدیم ہندوستان کی تحقیق کے لیے انڈولوجی انسٹی ٹیوٹ قائم کیے گئے ہیں۔

سوال: آپ کے ذاتی کتب خانے میں صدیوں پرانے مخطوطات، مہریں اور دیگر نایاب اشیا موجود ہیں۔ یہ چیزیں آپ نے کس طرح حاصل کیں؟

جواب: پرانی کتابیں، مخطوطے اور مغلیہ عہد کے نوادرات جمع کرنے کا شوق مجھے کالج کے زمانے سے رہا ہے۔ میں پرانے خاندانوں کو تلاش کرکے ان سے رابطہ قائم کرتا تھا۔ ان کے پاس ایسے ذخیرے مل جایا کرتے تھے یا پرانی کتابوں کے تاجروں سے رابطہ رکھتا تھا۔ ان سے کام کی تمام چیزیں حاصل ہو جاتی تھیں۔ دھیرے دھیرے لوگوں کو میرے شوق کا علم ہوا تو بعض لوگ میرے گھر آکر مجھے مطلوبہ اشیا دینے لگے۔

سوال: آپ نے پونے میں اورینٹل ریسرچ فاؤنڈیشن قائم کیا ہے۔ اس کے قیام کے خاص مقاصد کیا ہیں اور ان میں کس حد تک کامیابی مل رہی ہے؟

جواب: میرا مقصد یہ تھا کہ پرانے مخطوطات جن کا تحقیق سے تعلق ہو، محفوظ ہو جائیں۔ ان اشیا پر میرے مسلسل مضامین مراٹھی اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ کچھ مخطوطے مرتب کرکے میں نے شائع کیے ہیں۔ 2000 میں میں نے ایک جرمن تھیسس شائع کیا جو ایک آسٹرین خاتون نے لکھا تھا جس کا موضوع 'مہورت' تھا۔ اس موضوع سے متعلق پرانی کتب کے حوالے میرے کتب خانے سے دیے گئے تھے۔ کتاب عالمی پیمانے پر مقبول ہوئی ہے۔

سوال: آپ کو تحقیق سے دلچسپی ہے۔ اُردو تحقیق کی موجودہ سمت ورفتار پر کچھ روشنی ڈالیے۔

جواب: ہمارے یہاں تحقیق کے میدان میں کافی کام ہوا ہے اور اب بھی ہو رہا ہے۔ کدم راؤ پدم راؤ جیسا مخطوطہ شائع ہو چکا ہے۔ قدیم دکنی اور قدیم اُردو لغت پر بھی کام ہو رہا ہے۔ مختلف صوبوں کی اردو ادب کی تاریخ مرتب کی جا رہی ہے۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔

سوال: آپ کی کتاب ''جانشین داغ بھائی جان عاشق'' کے بارے میں محققین کا خیال ہے کہ اس کے سرورق پر دی گئی تصویر کسی اور کی ہے اور پورا کلام بھی بھائی جان عاشق کا نہیں ہے۔ اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب: اس سلسلے میں عرض ہے کہ جو تصویر میں نے شائع کی ہے وہ محض آرائش کے لیے تھی۔ بھائی جان عاشق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ جہاں تک کلام کا تعلق ہے مجھے جو دستیاب ہوا وہ میں نے شائع کیا۔ مجھے بھائی جان عاشق کے کلام کا چھوٹا سا حصہ ملا تھا جسے میں نے کالی داس گپتا رضا صاحب سے دکھایا تھا۔ ان کی تصدیق کے بعد ہی میں نے اسے شائع کیا تھا۔

سوال: پونے کا علمی و ادبی ماحول کیسا ہے؟

جواب: پونہ کو عروسِ دکن کہا جاتا ہے۔ مراٹھی کے نامور ادیب، شاعر اور محقق یہاں پیدا ہوئے۔ شیوا جی کے زمانے سے یہاں فارسی زبان رائج تھی، اس لیے پچھلی صدی کی تمام تحریریں فارسی زبان میں ملتی ہیں۔ یہاں اردو کی نشر واشاعت کا سلسلہ بھی زمانۂ قدیم سے جاری ہے۔ یہاں سے اردو کا رسالہ 'اسباق' شائع ہوتا ہے۔ اردو ادب پر کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ شعری مجموعے شائع ہوتے ہیں۔ ادبی نشستیں ہوتی ہیں۔ آل انڈیا مشاعرے ہوتے ہیں۔ یہاں آزادی سے پہلے اُردو کے بڑے ادیب وشعرا آکر رہے اور اپنی خدمات پیش کیں۔

سوال: اردو کے فروغ کے لیے آپ کے ذہن میں کیا تجاویز ہیں؟

جواب: اردو کے فروغ کا سب سے موثر ذریعہ تو اردو ذریعۂ تعلیم ہی ہے۔ اردو اگر اسکولوں میں پڑھائی جائے گی تو اس کی سماجی حیثیت مستحکم

ہوگی اور ایک بات بتا دوں کہ ہمارا شہر میں اردو کے سب سے زیادہ اسکول ہیں جو اردو والوں کے لیے باعث فخر ہے۔

سوال: آپ نے تاریخ، آثارِ قدیمہ، ادب اور تہذیب و تمدن جیسے مختلف میدانوں میں اپنی صلاحیت کے جوہر دکھائے ہیں۔ آپ بیک وقت ان تمام موضوعات پر کیسے کام کر لیتے ہیں؟

جواب: یہ مالک کی مہربانی ہے جو مجھے اتنے سارے کام کرنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ انڈولوجی ایسا موضوع ہے جس کی کئی شاخیں ہیں۔ اس میدان میں اترنے کے بعد الگ الگ کاموں اور موضوعات سے آشنائی ہوتی چلی جاتی ہے اور تلاش و جستجو کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جاتا ہے۔ آخر میں آدمی اس کام کے تئیں وقف ہو جاتا ہے۔

سوال: اردو زبان و ادب اور تعلیم کے فروغ کے ضمن میں قومی اردو کونسل کی خدمات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب: قومی اردو کونسل نے اس سلسلے میں جو اہم کام کیے ہیں جس سے پوری "اردو دنیا" واقف ہے۔ قومی کونسل کی کتابوں کی اپنی الگ اہمیت ہے۔ پوری "اردو دنیا" میں ان کتابوں کے حوالے دیے جاتے ہیں۔ تحقیق اور تنقید کے موضوعات پر قومی اردو کونسل کی کتابیں نہ صرف قابلِ مطالعہ ہیں بلکہ قابلِ حوالہ بھی ہیں۔

سوال: "اردو دنیا" کے قارئین کے نام آپ کیا پیغام دیں گے؟

جواب: میرا پیغامِ محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

❑❑❑

حالی

مصنف: صالحہ عابد حسین

ایک شاعر، ادیب، نقاد، سوانح نگار کے ساتھ ساتھ مولانا الطاف حسین حالی ایک سماجی مصلح بھی تھے۔ انھوں نے نہ صرف مسلمانوں کی اصلاح کے لیے شاعری کا سہارا لیا بلکہ شعر و ادب کی کمزوریوں کی بھی نشان دہی کی اور اچھے اور معیاری ادب کی تخلیق کی ترغیب دی۔ صالحہ عابد حسین نے حالی کی شخصیت اور زندگی کے تمام گوشے اس کتاب میں اجاگر کیے ہیں۔

صفحات: 68، قیمت -/15 روپے

محمد حسین آزاد

مصنف: نند کشور وکرم

محمد حسین آزاد ہمارے ان اکابرین میں سے ہیں جنھوں نے اردو کی ادبی تاریخ کا رخ موڑنے میں اہم رول ادا کیا۔ انجمن پنجاب کے ذریعے انھوں نے جدید نظم کو فروغ دینے کے ساتھ آبِ حیات، دربارِ اکبری، نیرنگِ خیال اور سخندانِ فارس جیسی اہم کتابیں بھی لکھیں۔ نند کشور وکرم نے اس کتاب میں آزاد کا بھرپور تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 79، قیمت: -/18 روپے

اقبال کی کہانی

مصنف: جگن ناتھ آزاد

اقبال وہ عظیم شاعر اور فلسفی ہے جسے عالمی ادب کے منظرنامے میں اہم مقام حاصل ہے۔ شاعر اور فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ شگفتہ مزاج انسان بھی تھے۔ ان کی علمی اور ادبی بحثوں سے بڑے باریک نکتے، اسرار اور لطیفوں کے چمن زار کھلتے تھے۔ اقبال کو اپنے ملک و قوم کے بچوں کے مستقبل سے والہانہ لگاؤ تھا جس کے سبب انھوں نے بچوں کے لیے مضامین لکھے اور خوب صورت نظمیں کہیں جنھیں پڑھ کر بچے اچھے شہری بن سکتے ہیں۔ ماہر اقبالیات جگن ناتھ آزاد نے اس کتاب میں اقبال کا جامع تعارف کرایا ہے۔

صفحات: 83، قیمت: -/11 روپے

جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن

مصنف: ظفر محمود

جوش ملیح آبادی اردو شعر و ادب کا ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے نہ صرف شاعری کو خوب صورت زبان عطا کی بلکہ نثر میں بھی گل کاری کی ہے۔ ان کے شعر و ادب کے مطالعے سے خود اعتمادی، جوش اور اپنے ملک و تہذیب کی بقا کے لیے سینہ سپر ہونے کا پیغام ملتا ہے۔ نہ صرف ان کا فن بلکہ خود شاعر کی زندگی کے حالات اس پیغام کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ ظفر محمود نے "جوش ملیح آبادی: شخصیت اور فن" میں شاعر کی زندگی اور فن کے اہم گوشوں کو اجاگر کیا ہے جن سے نئی نسل کی ذہنی و علمی تربیت ہوتی ہے۔

صفحات: 105، قیمت -/38 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسبِ ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

م۔ جہانگیر وانی

امریکہ میں اردو کی مقبولیت

محبانِ اردو کے لیے یہ جاننا کافی دلچسپی کا باعث ہے کہ اردو زبان نے دور دیش امریکہ میں ان دنوں تیزی سے مقبولیت حاصل کی ہے اور اس مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ آج ویب پر بھی اردو زبان بہت نمایاں طور پر موجود ہے۔ ویب سائٹ پر شاعری اور ادب کی دیگر اصناف آسانی سے اردو رسم خط میں پڑھی جا سکتی ہیں۔ امریکہ تنوع اور رنگا رنگی کی سرزمین ہے۔ ہر روز سیکڑوں نئے تارکین وطن امریکہ آتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان تارکین وطن کو بہتر طور پر سمجھنے اور ان کی ضرورتوں سے واقف ہونے کے لیے غیر ملکی زبان کے پروگرام چلانے کے کافی امکانات موجود ہیں۔ کیونکہ صرف 9 فیصد امریکی ایسے ہیں جو اپنی مادری زبان اور دوسری کوئی زبان بھی یکساں روانی سے بول سکتے ہیں جب کہ ایسے یورپی باشندوں کی تعداد 53 فیصد ہے جن کو اپنی زبان اور کسی دوسری زبان پر بھی یکساں عبور حاصل ہے۔

جولائی 2004 کی ایک امریکی سرکاری رپورٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ دہشت پسندی مخالف اور کاؤنٹر انٹلی جنس سے تعلق رکھنے والے شعبوں میں زبانوں کے مترجمین کی زبردست کمی ہے۔ اگرچہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کی خدمات حاصل کی جا رہی ہیں لیکن اس ایجنسی کو بھی ان زبانوں میں کافی مہارت رکھنے والے لوگ تلاش کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے اور ترجمہ طلب مواد کا انبار لگتا جا رہا ہے۔ ان رپورٹوں کے مطابق 11 ستمبر 2001 کو 9 فیصد اردو مترجمین کی ضرورت تھی جو یکم اپریل 2004 تک بڑھ کر صرف ایف بی آئی کے لیے 29 فیصد ہو گئی۔

2002 میں امریکہ میں 1147 اضافی زبانوں کی تدریس کا انتظام تھا۔ ان اضافی زبانوں کے طلبہ پورے ملک میں 25000 تھے۔ کچھ زبانوں جیسے کہ ارمانک، ہوائی، ہندی، فارسی، پولش، سواحلی اور ویتنامی کے پڑھنے والوں کی تعداد 1000 سے زیادہ تھی۔ اردو اور پشتو جیسی انتہائی اہم زبانوں سمیت بقیہ زبانیں بہت کم لوگ پڑھتے تھے۔

ان ضرورتوں کی تکمیل کے لیے حکومت نے خصوصی ریسورس سینٹر قائم کیے۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں ٹائٹل VI نیشنل ریسورس سینٹر ان ضروریات کی تکمیل کے انتہائی اہم وسائل ہیں۔ ان قومی وسائل مراکز نے جو رپورٹ دی ہے اس کے مطابق کم پڑھائی جانے والی زبانوں، جن کو لیس کومنلی ٹاوٹ لینگویج (Less Commonly taught Language) کہتے ہیں، میں 60 فیصد سے زیادہ طلبہ ایسی 10 زبانیں پڑھتے ہیں جن کو امریکی محکمۂ دفاع کے نیشنل سیکورٹی ایجوکیشن پروگرام کے تحت اہم زبان سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر 02-2001 میں جاپانی زبان پڑھنے والے طلبہ کی تعداد 5580 تھی۔ چینی پڑھنے والے طلبہ 5050 تھے۔ روسی پڑھنے والوں کی تعداد 2205، عربی پڑھنے والوں کی 2045، کوریائی پڑھنے والوں کی 1525، ہندی/اردو پڑھنے والوں کی 840 اور فارسی پڑھنے والوں کی تعداد 800 تھی۔ اس کے علاوہ ٹائٹل VI ایف ایل اے ایس فیلوشپ پانے والوں کی سب سے بڑی تعداد ان لوگوں کی ہی ہے جو یہ زبانیں پڑھ رہے ہیں۔

حکومت کے اندر اور باہر دونوں طرف غیر ملکی زبانوں کے ماہرین کو اس کی تشویش ہے کہ غیر ملکی زبانیں روانی کے ساتھ بولنے والوں کی جو ضرورت قوم کو ہے وہ پوری نہیں ہو رہی ہے۔ سرد جنگ کے دنوں میں قومی دفاعی تعلیمی قانون کے تحت غیر ملکی زبانوں اور غیر ملکی علاقہ جات کے مطالعے کے لیے حکومت نے مدد دینے کا کام شروع کیا۔ اس وقت امریکی یونیورسٹیوں کے 30,000 یا اس سے زیادہ ایسے طلبہ کو مدد دی جانے لگی جو ہر سال روسی زبان اور علاقہ کے کورس میں داخلہ لیتے تھے۔ 11 ستمبر 2001 کے حملے کے بعد پھر ایک بار امریکیوں کو مختلف زبانوں، خاص کر مشرقِ وسطیٰ اور جنوبی ایشیا کے خطوں کی زبانوں میں مہارت حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا ہے۔

صرف وفاقی حکومت میں 70 سے زیادہ ایجنسیاں ایسی ہیں جن کو غیر ملکی زبانوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور ایک ایجنسی نے تو امریکی کانگریس کو یہاں تک رپورٹ دی ہے کہ 80 مختلف زبانوں کے جاننے والے 30,000 سے زائد لوگوں کی اسے ضرورت ہے۔ جنرل اکاؤنٹنگ آفس کی جنوری 2002 کی ایک رپورٹ میں یہ کہا گیا کہ زبان کی تربیت حاصل کرنے والے عملہ جات کی تعداد میں کمی کی وجہ سے اس ایجنسی کے کام کاج پر منفی اثر پڑ رہا ہے اور امریکہ کی فوج، قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں، انٹلی جنس، دہشت گردی

مخالف اداروں کے کام کاج اور سفارتی کوششوں میں رکاوٹ آ رہی ہے۔

غیر ملکی علاقوں اور زبان کے ماہرین کے لیے امریکی ضرورت پوری کرنے میں حوصلہ افزائی اور مدد کے لیے وفاقی حکومت نے ان پروگراموں کو مدنظر رکھتے ہوئے فیلوشپ منظور کی ہے۔ 03-2002 کے تعلیمی سال میں یہ طلبہ پورے ملک کے اندر 50 سے زیادہ یونیورسٹیوں کے 1631 گریجویٹ طلبہ میں شامل تھے جن کو 103 کم پڑھائی جانے والی زبانوں کی تدریس کے لیے فورن لینگویج اینڈ ایریا اسٹڈیز فیلوشپ دی گئی۔

امریکی یونیورسٹیوں میں کم پڑھائی جانے والی زبانوں کی تدریس میں گذشتہ 45 برسوں میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ 1959 میں حکام نے سوویت یونین کے اسپتنک چھوڑنے کے بعد امریکی کانگریس میں ایک باضابطہ قانون بنا کر پہلی بار وفاقی فنڈ سے غیر ملکی زبان پڑھنے والوں کو فیلوشپ دینے کا فیصلہ کیا اور 6 زبانیں پڑھنے والے صرف 171 طلبہ کو فیلوشپ دی۔ امریکی کمشنر آف ایجوکیشن نے ان چھ زبانوں یعنی عربی، چینی، جاپانی، ہندی، اردو، پرتگالی اور روسی کو اس وقت اہم زبانیں قرار دیا تھا۔

جو زبانیں کم پڑھائی جاتی ہیں ان میں سے ایک زبان اردو ہے۔ یہ زبان مشرق وسطی اور جنوبی ایشیائی خطے میں بہت بڑے پیمانے پر بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ 9/11 کے حملے کے بعد ان خطوں کی طرف توجہ بہت زیادہ بڑھ گئی اور اس طرح ان خطوں کی زبانوں کی طرف بھی توجہ بڑھی۔

اس کے علاوہ پورے امریکہ میں بہت سے اداروں میں یا تو اردو یا اردو/ہندی پروگرام شروع کیا گیا۔ ایسی درسگاہوں میں انڈیانا یونیورسٹی، لویولا یونیورسٹی شکاگو، پرسٹن انسٹی ٹیوٹ فار انٹرنیشنل اینڈ ریجنل اسٹڈیز، رٹگرس یونیورسٹی، اسٹیٹ یونیورسٹی آف نیویارک اسٹونی بروک، یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، لاس اینجلس، یونیورسٹی آف ہوائی، ییل یونیورسٹی اور کولمبیا یونیورسٹی کے نام نمایاں ہیں۔ ان پروگراموں کے تحت ایسے بین موضوعاتی نصاب پیش کیے جاتے ہیں جن میں توجہ جنوبی ایشیا پر اور ہندی/اردو کی تدریس پر مرکوز رکھی جاتی ہے۔ ان میں سے بہت سی یونیورسٹیوں میں ساؤتھ ایشیا اسٹڈیز کے لیے کمیٹیاں بنائی گئی ہیں جو تعلیمی کانفرنس سیمینار، گول میز مذاکرات اور جنوبی ایشیا کے بہت سارے معاملات پر لیکچر اور علمی معاملات تک پہنچنے کے لیے مشترکہ علاقائی دلچسپی رکھنے والے طلبہ اور اساتذہ کے بین موضوعاتی فورم کا اہتمام کرتی ہے۔ یہ ادارے انڈر گریجویٹ اور گریجویٹ پروگرام چلاتے ہیں جن کے تحت بی.اے. اور ایم.اے. کی ڈگری دی جاتی ہے اس کے علاوہ بعض اس سے چھوٹے پروگرام بھی چلائے جاتے ہیں۔

اردو صرف سیاسی نقطۂ نگاہ سے ہی اہم نہیں ہے بلکہ تاریخی تحقیق کے لیے بھی اس کی کافی اہمیت ہے۔ برصغیر کے بہت سے تاریخی دستاویزات مغلیہ عہد کے ہیں اور زیادہ تر اردو میں لکھے ہوئے ہیں۔ ان دستاویزات کا ترجمہ کرنے اور ان پر تحقیق کرنے کے لیے اس زبان کے ماہرین کی ضرورت ہے۔ اسلام کے حوالے سے بھی یہ ایک اہم زبان ہے۔ قرآن و احادیث اور اسلامی فقہ پر قابل قدر اور مستند کاموں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ اردو میں موجود ہے۔ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ اس زبان میں صرف مذہبی ادب ہی دستیاب ہے بلکہ ترقی پسند، سیکولر ادب کا ایک عظیم الشان سرمایہ بھی موجود ہے اور اسی وجہ سے یہ زبان اپنی قدر و قیمت کے باوصف ایک مخصوص اہمیت و افادیت کی حامل ہے۔

(بہ شکریہ "آئین" نئی دہلی، مارچ، اپریل 2006)

□□□

لفظ

شاعر: آل احمد سرور

پروفیسر آل احمد سرور کا شمار اردو کے اہم دور نقادوں میں ہوتا ہے مگر وہ ایک نغز گو شاعر بھی تھے۔ ان کی شاعری ماضی کے اکتسابات کی حامل، حال کے میلانات کی ترجمان اور مستقبل کے امکانات کی نقیب ہے۔ سرور صاحب کی زندگی میں ان کے تین شعری مجموعے "سلسبیل"، "ذوق جنوں" اور "خواب اور خلش" شائع ہوئے۔ "لفظ" ان کا آخری شعری مجموعہ ہے۔

صفحات: 95، قیمت: -/64 روپے

مقالاتِ مسعود

مصنف: مسعود حسین خاں

یہ کتاب ممتاز ماہر لسانیات پروفیسر مسعود حسین خاں کے سولہ علمی مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اردو صوتیات، اقبال کا صوتی آہنگ، غالب کے خطوط کی لسانی اہمیت، اردو لغت نویسی کے مسائل وغیرہ مختلف موضوعات زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات: 230، قیمت: -/18.50 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر.کے. پورم، نئی دہلی-110066

دانش غنی

ایس.آر.رنگا ناتھن

لائبریری سائنس اور پروفیسر ایس.آر.رنگا ناتھن میں بڑا گہرا تعلق ہے۔ ان کی خدمات کو لائبریری سائنس سے الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے انھیں ہندوستان میں لائبریری سائنس کا بانی (فادر آف لائبریری سائنس) کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر ایس.آر.رنگا ناتھن کا پورا نام شیالی راما مورتا رنگا ناتھن تھا۔ وہ 9اگست 1892 کو تامل ناڈو کے تنجور ضلع کے چھوٹے سے قصبے شیالی میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے 1908 تک شیالی کے ہندو ہائی اسکول میں اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کرسچن کالج مدراس میں داخلہ لیا۔ بی.اے اول درجے سے کامیاب ہونے کے بعد ڈاکٹر ایس آر.رنگا ناتھن نے ریاضیات میں ایم.اے.کیا اور ایل.ٹی.کی ڈگری حاصل کی۔

1919 میں ایس.آر.رنگا ناتھن کا ریاستی کالج نیہا پورٹ میں ریاضی اور علم طبیعات کے مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے پریسیڈنسی کالج مدراس میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ 1929 میں مدراس یونیورسٹی کی لائبریری میں پہلی بار مستقل لائبریرین کی حیثیت سے آپ کا تقرر ہوا۔ اسی سال ایس.آر.رنگا ناتھن کو یونیورسٹی کالج آف لائبریرین شپ لندن میں لائبریری سائنس کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ 1928 میں انھوں نے مدراس میں پہلا تربیتی کیمپ شروع کیا اور اسی سال لائبریری یونین کا قیام عمل میں لایا اور کئی برسوں تک اس کے سکریٹری رہے۔ 1929 میں ان کی شادی شاردا رنگا ناتھن سے ہوئی۔ ایس.آر.رنگا ناتھن 1945 سے 1947 تک بنارس ہندو یونیورسٹی کے لائبریرین کے عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد 1947 سے 1955 تک دلی یونیورسٹی میں لائبریری سائنس کے پروفیسر رہے۔ 1948 میں ان کو انڈین لائبریری ایسوسی ایشن کا صدر منتخب کیا گیا۔ انھیں 1948 میں ریاست مدراس کے لیے لائبریری قانون کو عمل میں لانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ 1957 میں ایس.آر.رنگا ناتھن نے مدراس یونیورسٹی میں شاردا رنگا ناتھن فیلو شپ آف لائبریری سائنس کا قیام عمل میں لایا۔ 1962 میں Indian Statistical Institute کے زیر اہتمام انھوں نے بنگلور میں ڈی.آر.ٹی.سی.(Documentation Research and Training Centre) قائم کیا۔ 27 ستمبر 1972 کو اَسّی (80) سال کی عمر میں ایک اسپتال میں آپ کا انتقال ہوا۔

ہندوستان میں لائبریری کی تحریک شروع کرنے اور اسے رفتار دینے کا سہرا ایس.آر.رنگا ناتھن کے ہی سر ہے۔ 1925 میں لندن سے واپس لوٹنے کے بعد انھوں نے عوامی کتب خانوں (Public Libraries) کی حالت بہتر بنانے پر پوری توجہ دی۔ اس سے پہلے کتب خانوں میں صرف کتابیں بھی رہتی تھیں۔ ان کتابوں کا استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ ہندوستان میں منارنامی ایک جگہ پر موبائل لائبریری شروع کرنے میں بھی ایس.آر.رنگا ناتھن کا ہاتھ ہے۔ ایس.آر.رنگا ناتھن کے ذریعے بنائے گئے قوانین و قواعد اور لائبریری سائنس کے پانچ اصولوں نے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

ایس.آر.رنگا ناتھن نے اپنی تقاریر، مضامین اور مقالوں سے کتب خانے کی دنیا کو ایک نئے طرز سے آشنا کیا۔ انھوں نے لائبریرین کی تنخواہ اور قومی اور بین الاقوامی سطح پر اعزاز و انعام کے ضمن میں کئی اہم کارنامے انجام دیے۔ یہ بھی ایس.آر.رنگا ناتھن کا ہی احسان ہے کہ اس دور میں لائبریرین کی تنخواہ اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے دوسرے ملازمین کے برابر ہے۔ انھوں نے لائبریری کے قانون کی اہمیت کو سمجھا اور ہندوستان میں بھی برطانیہ اور امریکہ کی طرز پر عوامی کتب خانے کا قانون عمل میں لانے کے لیے جدوجہد شروع کی۔

لائبریری سائنس کا شاید ہی کوئی گوشہ ہو جس پر ایس.آر.رنگا ناتھن نے مضامین نہ لکھے ہوں۔ انھوں نے اپنے نظریے کو پیش کرنے کے لیے ویدوں اور پرانوں کی مثالوں کا استعمال کرتے ہوئے تقریباً ساٹھ کتابیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی رسالوں اور اخباروں میں ان کے دو سو سے زیادہ مقالات اور تحقیقی مضامین شائع ہوئے جو لائبریری سائنس کے لیے نایاب تحفہ ہیں۔

ہندوستان میں جہاں کہیں بھی لائبریری سائنس کی تعلیم کا ذکر ہوتا ہے وہاں ایس.آر.رنگا ناتھن کا نام ضرور آتا ہے کیونکہ وہی پہلے شخص تھے جنھوں نے لائبریری سائنس کی اہمیت و افادیت کو سمجھ کر ہندوستان میں 1928 سے مدراس میں لائبریری سائنس کی تعلیم شروع کی۔ اس سے پہلے گوالیار کے مہاراجہ

گائیکواڑ سوم نے امریکہ سے ایک لائبریرین کو بلا کر تربیت دینا شروع کر دیا تھا لیکن صحیح معنوں میں لائبریری سائنس کی تعلیم کا آغاز ایس آر رنگا ناتھن نے ہی کیا۔ انھوں نے اس کا آغاز نہیں کیا ہوتا تو شاید ہندوستان میں جہاں آج تقریباً سو سے زائد یونیورسٹیوں میں لائبریری سائنس کی تعلیم دی جا رہی ہے وہ نہ ہوتی۔

ایس آر رنگا ناتھن کی کوششوں ہی سے دہلی یونیورسٹی میں سب سے پہلے ڈپلوما، بیچلر ڈگری، ماسٹر ڈگری اور پھر پی ایچ ڈی پروگرام شروع کیا گیا۔ انھی کی کوششوں سے لائبریری سائنس کا نصاب تیار کیا گیا جسے ملک کی سبھی یونیورسٹیوں میں پڑھایا جا رہا ہے۔

ایس آر رنگا ناتھن کی تصانیف Colon Classification اور Classified Catalogue Code سبھی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے 1961 میں ایس آر رنگا ناتھن کی صدارت میں ایک Review Commitee on Library Science کا اہتمام کیا جس نے ہندوستان میں لائبریری سائنس کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے کئی اہم امور انجام دیے۔

1957 میں صدر جمہوریہ ہند نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر لائبریری سائنس کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹر ایس آر رنگا ناتھن کو "پدم شری" کے اعزاز سے سرفراز کیا۔ دہلی یونیورسٹی نے آپ کے کارناموں کو سراہا اور 1948 میں ڈی لٹ کی ڈگری تفویض کی۔ 1970 میں امریکن لائبریری ایسوسی ایشن نے مارگریٹ مارنامی لائبریری سائنس کا انعام ڈاکٹر ایس آر رنگا ناتھن کو پیش کیا۔

بھارت سرکار نے 1965 میں ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کا قومی ریسرچ پروفیسر نامزد کیا۔ اس کے علاوہ لائبریری ایسوسی ایشن برطانیہ نے ڈاکٹر ایس آر رنگا ناتھن کو اپنے ادارے کا مستقل ممبر منتخب کیا۔ حکومت ہند نے رنگا ناتھن صدی کے موقعے پر ایک ڈاک ٹکٹ جاری کر کے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔

National Institute of Unani Medicine
Kattige Palya
Magadi Main Road
Bengalore-560091

□□□

خطبات آزادی (حصہ اول)

1921 سے 1946 کے درمیان کانگریس کے 17 اہم جلسے ہوئے جن کی صدارت حکیم اجمل خاں سی آر داس، محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو، مختار احمد انصاری، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے قومی رہنماؤں نے کی۔ اس کتاب میں آزادی سے قبل کانگریس کے جلسوں میں پیش کیے گئے تمام صدارتی خطبے جمع کر دیے گئے ہیں۔

صفحات: 580، قیمت -/280 روپے

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (حصہ اول)

مصنف: چارلس ڈکنس
مترجم: فضل حسنین

انگریزی کے عظیم ناول نگار چارلس ڈکنس کے ناول ڈیوڈ کاپر فیلڈ کو عالمی کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ اردو میں پہلی بار اس کا ترجمہ شائع کرنے کا شرف کونسل کو حاصل ہے۔ مترجم نے بے حد سادہ اور عام فہم زبان میں اس ناول کو اردو کا قالب عطا کیا ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔
تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

عبدالودود انصاری

غریب انسان کامیاب سائنس داں

کامیابی وہ خوبی ہے جس کے حصول میں محنت، مشقت اور تکالیف کے ساتھ ساتھ قدم قدم پر مادی و جذباتی قربانیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب بھی کسی عظیم شخصیت کی زندگی کی کتاب کے اوراق پلٹے جاتے ہیں تو دیکھا جاتا ہے کہ اکثر و بیشتر ترقی اسی نے کی جس کے نہ حالات سازگار تھے اور نہ ہی اسے ترقی کے مواقع آسانی کے ساتھ فراہم تھے۔ علاوہ ازیں بیشتر کی ابتدائی زندگیاں غربت اور مالی دشواریوں میں گھری نظر آتی ہیں اس کے باوجود وہ ہستیاں سخت محنت اور جدو جہد کر کے علم حاصل کرتی ہیں اور اپنے اپنے دور میں بام شہرت تک پہنچتی ہیں۔ ان کی انتھک محنتیں ہی ان کو اونچا مقام دلاتی ہیں اور یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ حالات سے نبرد آزما عمل پیہم، مسلسل صبر آزمائی اور مایوسیوں سے گریز جب کسی انسان کا کردار بن جاتے ہیں تب وہ بنی نوع انسان کی فلاح و ترقی کے لیے سنہرے کارنامے انجام دیتے ہیں ایسے انسانوں کے مرنے کے بعد بھی ان کی محنت رایگاں نہیں جاتی ہے بلکہ انسانیت کے محسنوں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ آیئے ایسے ان سائنس دانوں کی زندگیوں میں جھانک کر دیکھیں کہ کوئی لوہار کے بیٹے، کوئی بڑھئی کے فرزند کوئی معمولی کسان کے لخت جگر، کوئی عام حکیم کے نور نظر، کوئی مزدور کی اولاد اور کوئی قفل ساز کے چشم و چراغ تھے مگر اپنی غربت اور مفلسی کو ترقی کی راہ میں روڑہ نہیں بننے دیا۔

ابوالنصر الفارابی (Avennasar al-Farabi) : آپ کی پیدائش 878ء کو ترکستان کے شہر فاراب میں ہوئی۔ آپ ایک ماہر ریاضی داں گزرے ہیں۔ آپ بہت ہی غریب و مفلس گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مفلسی اتنی کہ چراغ میں تیل بھرنے کے پیسے نہ تھے۔ رات کو چوکیدار کی قندیل کی روشنی میں پڑھائی کی۔ آپ کی وفات 950ء کو ہوئی۔

جوہانس کیپلر (Johannes Kepler): آپ کی پیدائش 27 دسمبر 1571 کو جرمنی میں ہوئی۔ آپ بہت بڑے ریاضی داں اور ماہر نجوم گزرے ہیں۔ آپ نے نہایت ہی غریب خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے آنکھوں میں روشنی کے اثرات اور آنکھوں کی عینک کے ذریعہ بینائی بڑھنے کے راز کو منکشف کیا۔ آپ نے ہی مریخ سیارے کے راستے کو بیضاوی بتایا۔ آپ نے سیاروں کی گردش کے سلسلے سے تین کلیے پیش کیے۔ آپ نے ہی بتایا کہ جو سیارہ سورج سے جتنا قریب ہوگا اس کی گردش کی رفتار اتنی ہی تیز ہوگی۔ آپ کی وفات 15 نومبر 1630 کو ہوئی۔

انگو جانس (Inigo Jones): آپ کی پیدائش 15 جولائی 1573 کو انگلینڈ میں ہوئی۔ آپ فن عمارت کے ماہر (Architect) اور نقشہ نگار (Designer) تھے۔ آپ کی پیدائش ایک معمولی کپڑا فروش کے یہاں ہوئی۔ آپ نے کئی قابل دید عمارتوں کے ڈیزائن بنائے۔ آپ 21 جون 1652 کو دنیا سے رخصت ہوئے۔

جان رے (John Ray): آپ کی پیدائش 29 نومبر 1627 کو انگلینڈ میں ہوئی۔ آپ بہت بڑے ماہر نباتیات (Botanist) تھے۔ آپ ان پہلی کتابوں کی مصنف تھے جن میں پودوں کی درجہ بندی کی گئی ہے۔ آپ نے جنینیات (Embryology) اور عضویات نباتاتی (Plant Physiology) کے سلسلے سے گراں قدر باتیں بتائیں۔ آپ نے ہی سب سے پہلے بتایا کہ ایک تازہ درخت کی لکڑی میں پانی موجود رہتا ہے۔ آپ رائل سوسائٹی کے ممبر بھی رہے۔ آپ کا انتقال 17 جنوری 1705 کو ہوا۔

ہیرسن جان (Harrison John): آپ کی پیدائش مارچ 1693 کو انگلینڈ میں ہوئی۔ آپ بہت بڑے گھڑی ساز (Horologist) تھے۔ آپ ایک معمولی بڑھئی کے صاحبزادے تھے۔ آپ نے پہلی مرتبہ بحری جہاز گھڑی (Marine Chronometer) ایجاد کی۔ کچھ دنوں بعد مزید تین گھڑیاں ایجاد کیں۔ ہر گھڑی پہلے کے مقابلے میں زیادہ صحیح پیمائش کرتی تھی۔ آپ 24 مارچ 1776 کو دنیا سے کوچ کر گئے۔

تھامس نیوکومن (Thomas Newcomen): آپ کی پیدائش 3 دسمبر 1753 کو انگلینڈ میں ہوئی۔ آپ بھاپ انجن کے موجدوں میں شمار

کیے جاتے ہیں۔ آپ ایک لوہا فروش تھے۔ آپ 26 جون 1827 کو دنیا سے چل بسے۔

جیمس واٹ (James Watt): آپ کی پیدائش 19 جنوری 1736 کو اسکاٹ لینڈ میں ہوئی۔ آپ بہت بڑے انجینئر تھے۔ آپ کا شمار بھاپ کی طاقت کے جنم داتاؤں میں ہوتا ہے۔ آپ ایک جہاز کے بڑھئی کے بیٹے تھے۔ آپ کی صحت بچپن میں خراب رہتی تھی۔ 17 سال کی عمر میں ماں انتقال کر گئیں۔ آپ نے ہورس پاور (Horse Power) کا تصور دیا۔ قوت کی اکائی واٹ (Watt) آپ کے نام سے ہی منسوب ہے۔ آپ نے 25 اگست 1819 کو انتقال فرمایا۔

جیمس ہارگریوس (James Hargreaves): آپ کی پیدائش 8 جنوری 1720 کو انگلینڈ میں ہوئی۔ آپ کاتنے کی مشین (Spinning Machine) کے موجد ہیں۔ آپ نہایت ہی مفلوک الحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ غربت کی وجہ سے زیادہ تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے۔ آپ نے سوت کا تنے اور کپڑا بننے کا کام شروع کیا۔ آپ نے کاتنے کی جو مشین ایجاد کی اس کا نام اپنی شریک حیات کے نام پر اسپننگ جینی (Spinning Jenny) رکھا۔ آپ کا 22 اپریل 1778 کو انتقال ہوا۔

سموئل کرامپٹن (Samuel Crompton): آپ کی پیدائش 3 دسمبر 1753 کو انگلینڈ میں ہوئی۔ آپ کے والد ایک غریب کسان تھے۔ آپ نے بھی کاتنے کی ایک مشین ایجاد کی۔ آپ 26 جون 1827 کو دار فانی سے کوچ کر گئے۔

جارج اسٹیفنسن (George Stephenson): آپ کی پیدائش 1781 کو انگلینڈ میں ہوئی۔ آپ نے تیز رفتار انجن ایجاد کیا۔ آپ کے والد کوئلے کی کان میں ملازم تھے اور چھ بچوں کے باپ تھے۔ مفلسی اتنی کہ کوئی بھی بچہ، اسکول نہ جا سکا جیسے ہی چلنے پھرنے کے قابل ہوئے بچے کام پر لگا دیے گئے۔ آٹھ برس کی قلیل عمر میں جارج نے ایک پڑوسی کی گائیوں اور بھینسوں کو گھوڑے سے کھینچے جانے والی ریل کی پٹریوں سے الگ رکھنے کا کام کیا۔ نو برس کی عمر میں کان کے اندر کوئلے چھانٹنے کا کام کرنے لگے۔ 18 سال کی عمر تک لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ کچھ پیسے ہاتھ آئے تو شام کے ایک اسکول میں داخلہ لیا۔ 19 سال کی عمر میں جب انھوں نے اپنا نام لکھنا سیکھا تو فرط مسرت سے جھوم اٹھے۔ پھر آہستہ آہستہ ریاضی اور میکانیک میں مہارت حاصل کر لی۔ 1814 میں سخت کاوش اور محنت کر کے ریل کا انجن بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اور 1848 میں انتقال کر گئے۔

مائیکل فیراڈے (Michael Farady): کی پیدائش 22 ستمبر 1791 کو انگلینڈ میں ہوئی۔ آپ ماہر طبیعات اور کیمیاں داں تھے۔ مائیکل فیراڈے ایک لوہار کے بیٹے تھے۔ زندگی بڑی غریبی اور مفلسی میں گزری، یہاں تک کہ فاقہ کشی بھی کی۔ کتب فروش کے یہاں جلد سازی کا کام بھی کیا۔ جلد سازی کے لیے آئی ہوئی کتابوں کو مطالعہ کرتے تھے۔ مشہور سائنس داں ہمفری ڈیوی کے معاون کے طور پر کام کیا۔ مائیکل فیراڈے نے میگنیشیم دھات کے بارے میں اہم جانکاری دی اور الیکٹرک موٹر اور ڈائنامو ایجاد کیے۔ علاوہ ازیں برقی پاشیدگی (Electrolysis) اور برقی مقناطیسی امالہ (Electro Magnetic Indiction) کے کلیے بھی پیش کیے۔ ان کی وفات 25 اگست 1867 کو ہوئی۔

جان ڈیرے (John Deere): کی پیدائش 7 فروری 1804 کو امریکہ میں ہوئی۔ انھوں نے زراعت کے بہت سارے اوزار ایجاد کیے۔ جان ڈیرے اپنی غربت اور مفلسی کے باعث ایک لوہار کے یہاں کام کرتے تھے۔ ان کی وفات 17 مئی 1886 کو ہوئی۔

ولیم سیوارڈ بوروگس (William Seward Burroughs): 28 جنوری 1855 کو امریکہ میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک سائنس داں اور بڑے موجد تھے۔ غریبی کا یہ عالم تھا کہ پندرہ برس کی عمر سے اپنے اخراجات خود اٹھانے لگے تھے۔ آپ نے حساب کرنے کی مشین (Calculating Machine) ایجاد کی۔ جان اسکاٹ میڈل سے نوازے گئے۔ ان کی وفات 15 ستمبر 1899 کو ہوئی۔

میری کیوری (Marie Curie): کی پیدائش 7 نومبر 1867 کو پولینڈ میں ہوئی۔ آپ بڑی کیمیا داں تھیں۔ ان کی ابتدائی زندگی مفلسی میں گزری۔ آپ اپنے شوہر کے ساتھ مل کر پولونیم (Polonium) اور ریڈیم (Radium) جیسے عناصر کا پتا لگایا۔ آپ دنیا کی پہلی خاتون ہیں جنھیں دو مرتبہ نوبل پرائز ملا۔ آپ لیوکیمیا (Leukemia) کے مرض میں مبتلا ہو کر 4 جولائی 1934 کو وفات پا گئیں۔

کارل فریڈرک گاؤس (Carl Friedrich Gauss): کی پیدائش 30 اپریل 1777 کو جرمنی میں ہوئی۔ آپ بڑے ریاضی داں، ماہر طبیعات اور

ماہر نجوم گزرے ہیں۔ آپ نہایت ہی غریب گھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ نے بجلی، مقناطیس اور تجاذب (Gravitation) میں ریاضی کا استعمال بتایا۔ آپ 23 فروری 1855 کو دنیا سے کوچ کر گئے۔

ٹامس الوا ایڈیسن (Thomas Alva Edition): کی پیدائش 11 فروری 1847 کو امریکہ میں ہوئی۔ انھوں نے ابتدائی زندگی نہایت ہی غریبی میں بسر کی۔ 12 سال کی عمر میں ٹرین میں اخبار اور مٹھائی فروخت کر کے زندگی کی کفالت کی۔ انھوں نے بے شمار چیزیں ایجاد کیں۔ کم و بیش 1093 ایجادات ایسی ہیں جن میں بلا واسطہ یا بالواسطہ ان کی خدمات پوشیدہ ہیں۔ ان کی ایجادات میں بجلی بلب سب سے افضل ہیں۔ ٹامس الوا ایڈیسن 18 اکتوبر 1937 کو اس دنیا سے چل بسے۔

جان لوگی بیرڈ (John Logi Baired): کی پیدائش 13 اگست 1888 کو اسکاٹ لینڈ میں ہوئی۔ آپ ٹیلی ویژن کے موجد ہیں۔ ان کے والد ایک تعلیم یافتہ پادری تھے مگر ان کی آمدنی نہایت قلیل تھی۔ آپ نے معاشی دشواریوں کا سامنا کیا۔ اپنی مفلسی دور کرنے کے لیے کبھی صابن کا کاروبار کیا، کبھی مربہ اور چٹنی بنا کر فروخت کیا تو کبھی موزے تیار کرنے لگے۔ آپ 14 جون 1926 کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ولیم کونارڈ رانٹجن (Wilhem Konard Roentgen): کی پیدائش 22 مارچ 1845 کو جرمنی میں ہوئی۔ آپ ایکسرے (X-Ray) کے موجد ہیں۔ آپ ایک غریب کسان کے گھر پیدا ہوئے۔ آپ کا انتقال 10 فروری 1923 کو ہوا۔

بنجامن فرینکلن (Benjamin Franklin): کی پیدائش 17 جنوری 1706 کو امریکہ میں ہوئی۔ آپ مشہور سائنس داں ہیں۔ آپ کے والد صابن سازی اور موم بتی بنانے کا کام کرتے تھے۔ انھوں نے برق کے میدان میں نہایت اہم کارنامے انجام دیے۔ آپ برق ربا (Lightning Conductor) کے موجد ہیں۔ آپ کی وفات 17 اپریل 1790 کو ہوئی۔

جارج سائمن اوم (George Simon Ohm): کی پیدائش 16 مارچ 1789 کو جرمنی میں ہوئی۔ آپ ایک ماہر طبیعات تھے۔ آپ ابتداً ایک قفل ساز کے یہاں ملازم تھے۔ آپ نے بجلی کی رکاوٹ کا اہم قانون دریافت کیا۔ مزاحمت کی اکائی اوم (Ohm) آپ کے نام سے ہی منسوب ہے۔ آپ نے 6 جولائی 1854 کو اس دنیا سے خیر باد کہا۔

ایلی ونٹے (Aele Vante): کی پیدائش 8 دسمبر 1765 کو امریکہ میں ہوئی۔ آپ کے والد ایک معمولی کاشتکار تھے۔ آپ نے کاٹن جن (Cotton Gin) نامی مشین ایجاد کی جو کپاس کو تیزی اور سہولت سے صاف کرنے میں استعمال ہوتی ہے۔ آپ 8 جنوری 1825 کو انتقال کر گئے۔

رابرٹ ہچنگس گوڈارڈ (Robert Hutchings Goddard): کی پیدائش 5 اکتوبر 1882 کو امریکہ میں ہوئی۔ آپ کا شمار تیز رفتار راکٹ کے موجدوں میں ہوتا ہے۔ آپ ایک غریب انسان تھے۔ آپ کے پاس تجربے کرنے کے لیے پیسے نہ تھے۔ آپ نے اسمتھ سونین انسٹی ٹیوشن سے تجربے کرنے کے لیے قرض لیے اور اپنے تجربات میں کامیاب ہوئے۔ آپ کا انتقال 10 اگست 1945 کو ہوا۔

سر ہمفری ڈیوی (Sir Humphry Dary): کی پیدائش 16 جون 1806 کو انگلینڈ میں ہوئی۔ آپ ایک کیمیا داں (Chemist) تھے۔ والد کے انتقال کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری آپ کے سر آگئی۔ مقامی ڈاکٹر کے یہاں دوا سازی کے کام سیکھنے لگے اور جو کچھ آمدنی ہوتی اس سے گھر کے اخراجات پورے کرتے تھے۔ تاہم ان ناموافق حالات میں تحقیق سے کنارہ کش نہ ہوئے۔ آپ کی اہم ایجاد ڈیوی سیفٹی لیمپ ہے۔ آپ نے سوڈیم، میگنیشیم، پوٹاشیم اور کیلشیم جیسے عناصر دریافت کیے۔ سچ پوچھیے تو اپنے وقت کے مشہور سائنس داں مائیکل فیراڈے آپ کی ہی دریافت ہے۔ آپ 26 جنوری 1885 کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

روڈولف کرسچن کارل ڈیزل (Rodolf Christian Karl Diesel): کی پیدائش 18 مارچ 1858 کو جرمن والدین کے یہاں فرانس میں ہوئی۔ آپ ڈیزل انجن کے موجد ہیں۔ آپ کے والدین نہایت ہی غریب تھے لیکن تعلیم و تربیت میں بے حد سختی کے قائل تھے۔ ان کی ثانوی تعلیم کے دوران فرانس اور جرمنی میں ٹھن گئی جس کی وجہ سے فرانسیسی بچے ان سے نفرت کرنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے خاندان کو فرانس سے ملک بدر کر دیا گیا۔ شہرت کی بلندی پر پہنچنے کے بعد اپنے کاروباری سلسلے سے 29 ستمبر 1913 کو بحری سفر کیا اور راستے ہی میں لاپتا ہو گئے اغلب ہے کہ سمندر میں غرقاب ہو گئے۔

چیسٹر ایف کارلسن (Chester F. Carlson): کی پیدائش 1906 کو امریکہ میں ہوئی۔ آپ زیروکس مشین کے موجد ہیں۔ والدین معذور تھے۔

اپنے کنبے کی کفالت کے لیے پارٹ ٹائم کام بھی کرتے تھے اور پڑھائی لکھائی بھی کرتے تھے۔ نیو یارک میں بیل ٹیلی فون لیباریٹریز کے [illegible] شعبہ میں ملازمت بھی کی اور یہیں سے ایجاد کی راہ پر گامزن ہو گئے۔

ذیل میں ہندوستان کے چند ایسے ہی سائنس دانوں کا ذکر پیش کیا جا رہا ہے:

سری نواس رامانوجن (Srinivasa Ramanujan): کی پیدائش 22 ستمبر 1887 کو تامل ناڈو میں ہوئی۔ آپ بہت بڑے ریاضی داں تھے۔ آپ نے ایک غریب گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ ان کے والد کپڑے کی دکان میں معمولی منیم تھے۔ آپ نے نمبر تھیوری (Number Theory) عددوں کی تقسیم (Partition of Number) اور کسر مسلسل تھیوری (Theory of continued Fraction) میں گراں قدر اضافے کیے۔ رامانوجن پہلے ہندوستانی ہیں جو 1918 میں Royal Society of London کے لیے منتخب کیے گئے۔ آپ کی رحلت 26 اپریل 1920 کو ہوئی۔

میگھ ناد ساہا (Meghnad Saha): کی پیدائش 6 اکتوبر 1893 کو بنگلہ دیش میں ہوئی۔ آپ ایک عظیم سائنس داں تھے۔ ان کے والد کی ایک معمولی قسم کی پارچون کی دکان تھی۔ بڑی مشکل سے گھر کا خرچ چلتا تھا۔ آپ کی تعلیم کا خرچ ایک خیر خواہ نے اپنے ذمہ لیا۔ آپ اپنے اخراجات ٹیوشن پڑھا کر پورا کرتے تھے۔ آپ نے نیوکلیئر فزکس (Nuclear Physics) اور حرارتی افتراق (Thermar Dissociation) پر تحقیق کر کے کارآمد باتیں بتائیں۔ آپ نے 16 فروری 1956 کو دنیا کو خیر باد کہا۔

آر.سی. بوس (R.C. Bose): کی پیدائش 19 جون 1901 کو مدھیہ پردیش کے شہر ہوشنگ آباد میں ہوئی۔ آپ ایک نامور ریاضی داں تھے۔ آپ کی والدہ ایک بیماری میں فوت کر گئیں پھر دو سال بعد والد چل بسے۔ ایک بھائی، دو بہنوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ گھر کا سارا بوجھ آپ کے کاندھوں پر آ گیا جس کے لیے انھوں نے ٹیوشن پڑھانا شروع کیا۔ اس حالت میں بھی آپ نے اپنی پڑھائی جاری رکھی اور کئی وظیفے حاصل کیے۔ امتحان کی تیاری کے دوران ایک بار انھوں نے ٹیوشن پڑھانا بند کر دیا جس وجہ سے پیسوں کی سخت قلت ہو گئی۔ اچانک انھیں یاد آیا کہ ان کے والد کی الماری میں کچھ دوائیاں بچی ہوئی ہیں جن میں کونین کی ایک شیشی بھی ہے۔ اس وقت کونین کی قیمت بہت زیادہ تھی انھوں نے اسے فروخت کر کے اخراجات کے لیے رقم مہیا کی۔ آپ نے اپلائیڈ میتھمیٹکس (Applied Mathematics) اور پیور میتھمیٹکس (Pure Mathematics) دونوں میں ایم.اے. کیا۔ 1949 میں امریکہ چلے گئے اور یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا میں شماریات (Statistics) کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ آپ کی دو دریافت کافی مشہور ہیں۔ ایک سوئٹزرلینڈ کے اٹھارویں صدی کے نامور ریاضی داں لیونارڈ یولر کے مشہور حسابی قیاس (Mathematical Conjecture) کی غلط ثابت کرنا اور دوسرے مورس کوڈ (Mores Code) میں گراں قدر اضافے کرنا۔ 1976 میں امریکہ کے ایک بڑے اعزاز سے نوازے گئے۔ اس کے بعد یو.ایس. اکاڈمی آف سائنسز کے فیلو منتخب ہوئے۔

دیویندر لال (Devendra Lal): کی پیدائش 24 فروری 1929 کو بنارس میں ہوئی۔ آپ بہت بڑے ماہر طبیعات ارض (Geophysicists) تھے۔ آپ کے والدین غریب تھے۔ اسکول کے زمانے میں اپنا جیب خرچ سنگھار کا سامان اور خود اپنی تیار کی ہوئی روشنائی فروخت کر کے نکالا کرتے تھے۔ آپ 1967 میں ایس.ایس. بھٹناگر ایوارڈ اور 1965 میں کرشنن میڈل سے سرفراز کیے گئے۔ آپ یونائیٹڈ اسٹیٹس آف سائنسز کے غیر ملکی ایسوسی ایٹ بھی ہیں۔

ابوالفاخر زین العابدین عبدالکلام (Abul Paiker Jainulabedeen Abdul Kalam): کی پیدائش 15 اکتوبر 1931 کو تامل ناڈو میں ہوئی۔ آپ بہت بڑے سائنس داں اور ہندوستان کے گیارھویں صدر ہیں۔ آپ ایک غریب کشتی کے مالک کے فرزند ہیں۔ اپنی فیس کے لیے اخبار بیچتے تھے۔ انھیں اپنے انجینئرنگ ڈپلوما کے لیے بہن کے زیورات رہن رکھنے پڑے۔ آپ نے پانچ کامیاب ایٹمی دھماکے کے ساتھ ہندوستان کو ایک ایٹمی ملک بنا دیا۔ اب عالمی نقشے پر ہندوستان چھٹا ملک ہے جو سٹلائٹ میزائل داغنے میں کامیاب ہو گیا۔ آپ نے اپنی محنت سے ثابت کر دیا کہ ان پڑھ والدین کے گھر پیدا ہونے والا بھی ملک کی صدارت حاصل کر سکتا ہے۔ آپ پدم بھوشن (1981)، پدم وی بھوشن (1990) اور بھارت رتن (1997) جیسے اہم خطابات سے بھی نوازے گئے۔

Principal
Urdu Medium Govt. Teachers Training Institute
P.O. Nalikul, Dist. Hooghly-712407 (W.B.)

□□□

اردو خبرنامہ

قومی اردو کونسل کی بارہ کتابوں کا اجرا

● نئی دہلی، 27 جولائی۔ "قومی اردو کونسل اردو کے کلاسیکی متون کے ساتھ ساتھ سماجی علوم، سائنس اور انفارمیشن ٹیکنالوجی جیسے موضوعات پر بھی کتابیں شائع کر رہی ہے اور عصری ضرورتوں کے تحت ہر موضوع پر قارئین کو اردو میں کتابیں مہیا کرانے کی کوششوں میں مصروف ہے۔" ان خیالات کا اظہار ممتاز نقاد اور قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف لینگویج، لٹریچر اینڈ کلچر اسٹڈیز کے کمیٹی روم میں منعقدہ تقریب رسم اجرا میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر شمیم حنفی، پروفیسر محمد زماں آزردہ اور محترمہ رخشندہ جلیل بطور مہمان خصوصی موجود تھے۔

جلسے کے آغاز میں کونسل کے پرنسپل پبلیکیشن آفیسر ڈاکٹر آر. کے. بھٹ نے تمام شرکا کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کی کارگزاریوں پر مختصر روشنی ڈالی اور بتایا کہ ادارے نے اب تک مختلف موضوعات پر کوئی 1200 کتابیں شائع کی ہیں ان میں لغات، انسائیکلو پیڈیا، عالمی کلاسک، اردو کلاسیکی ادب، سائنس، تاریخ، جغرافیہ، صحافت، درسی کتب اور ادب اطفال خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ کونسل نے دہلی اور دہلی سے باہر کی یونیورسٹیوں میں اسی نوعیت کے مزید جلسے منعقد کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ طلبہ نئی مطبوعات سے واقف ہوں اور ان میں کتب بینی کے ذوق کو مہمیز کیا جا سکے۔

ہندوستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے چیئرپرسن پروفیسر محمد شاہد حسین نے جلسے میں ممتاز ادیب، شاعر اور صحافی جناب احمد ندیم قاسمی اور معروف نقاد اور ادیب جناب خورشید الاسلام کی رحلت پر اظہار تعزیت کیا اور حاضرین نے دو منٹ کی خاموشی اختیار کر کے مرحومین کو خراج عقیدت پیش کیا۔ بعد ازاں پروفیسر قمر رئیس کی کتاب "پریم چند کا تنقیدی مطالعہ" کا اجرا پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے، پروفیسر شمیم حنفی کی کتابوں "جدیدیت کی فلسفیانہ اساس" اور "نئی شعری روایت" کا اجرا جناب زبیر رضوی نے، پروفیسر محمد زماں آزردہ کی کتاب "مرزا سلامت علی دبیر — حیات اور کارنامے" کا اجرا م.ن. سعید نے، آل احمد سرور (مرحوم) کے شعری مجموعے "لفظ" کا اجرا ڈاکٹر خلیق انجم نے اور "جامع التذکرہ"، "کلیات مصحفی" (جلد چہارم) "تزک جہاں گیری"، "الیکٹرانکس ٹیکنالوجی"، "گرافک ڈیزائن"، "اردو سافٹ ویئر" اور "ڈیوڈ کاپر فیلڈ" کا اجرا جناب اقبال مجید نے کیا۔

پروفیسر صادق، ڈاکٹر خالد جاوید، ڈاکٹر فیروز عالم اور ڈاکٹر احمد محفوظ نے اول الذکر چار مصنفین کی کتابوں پر تبصرے پیش کیے۔ مصنفین نے بھی اس موقعے پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اجلسے میں اساتذہ اور طلبہ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ آخر میں ڈاکٹر آر. کے. بھٹ نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

پریم چند کی 125ویں سالگرہ پر سیمینار

● نئی دہلی، 29 جولائی۔ ہندوستانی زبان کے عظیم ترین افسانہ نگاروں میں سے ایک منشی پریم چند جتنے ہندوستان میں مقبول ہیں اس سے کم مقبول پاکستان میں بھی نہیں ہیں۔ پریم چند کے 125ویں یوم پیدائش کی تقریبات کے سلسلے میں ہندوستان آنے والے پاکستانی ادیبوں نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ افسانہ نگار مسعود اشعر، ڈراما نویس اصغر ندیم سید اور ادیب و نقاد مرزا حامد بیگ نے کہا کہ پریم چند نے اردو افسانے کی بنیاد رکھی۔ ان کے بغیر اردو ادب کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اصغر ندیم سید نے بتایا کہ پریم چند پاکستان میں میٹرک سے لے کر ایم اے تک کے نصاب میں شامل ہیں۔ وہ برصغیر کے مسائل کے مفسر ہیں۔ وہ ہندوستان اور پاکستان کے مابین دوستی کے لیے پل کی طرح ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ پریم چند کے 125ویں یوم پیدائش پر پاکستان کے کئی شہروں میں ان پر سیمینار منعقد کیے گئے۔ جناب اصغر ندیم نے بتایا کہ انھوں نے پاکستان میں پریم چند کی دو کہانیوں "کفن" اور "اماوس کی رات" کو ڈرامے کی شکل میں پیش کیا، جسے کافی سراہا گیا۔ پریم چند کے پوتے آلوک رائے نے ہنسا کشر کی جانب سے ایوان غالب میں "پریم چند اذیت، جدو جہد اور خواب" کے عنوان سے منعقد دو روزہ سیمینار کے پہلے دن کہا کہ پریم چند کو سچا خراج عقیدت یہی ہوگا کہ ان کے مجسمے نصب کرنے کے بجائے وہ کام کیے جائیں جو اگر وہ آج زندہ ہوتے تو کرتے۔

اس موقعے پر پاکستان کے سینئر مارکسی مفکر پروفیسر اعجاز احمد نے پریم چند کے ادب کی اذیت کو آج کی دنیا میں جاری اذیتوں سے جوڑتے ہوئے کہا کہ پریم چند نے ہندی کے ساتھ اردو ادب کو بھی پہلی بار سماجی مسائل سے جوڑا۔ انھوں نے کہا کہ جب پریم چند نے لکھنا شروع کیا تو تحریک آزادی پوری طرح شروع نہیں ہوئی تھی اور جب لکھنا ختم کیا تو کانگریس اپنی سرکار بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اس طرح ان کی تحریریں ہندوستان کی تاریخ کے ایک اہم دور کی دستاویز ہیں۔ ماہنامہ "ہنس" کے مدیر راجندر یادو نے بتایا کہ ہمارا ادب پریم چند کے وقت سے اذیت، اور جدو جہد سے گزر کر خوابوں پر

مرکوز ہوا۔ پروفیسر شیو کمار اور پروفیسر اشوک واجپئی وغیرہ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

سیمینار کے دوسرے دن مرکزی وزیر ثقافت محترمہ امبیکا سونی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پریم چند کی کہانیوں پر مبنی ٹیلی فلمیں بنائی جائیں گی تاکہ پریم چند کو ملک کے گھر گھر تک پہنچایا جا سکے اور نوجوان نسل ان کی تصانیف سے رہنمائی حاصل کر سکے۔ پریم چند نے ہندوستانی ادب کی عالمی پیمانے پر شناخت قائم کی۔ انھوں نے کہا کہ ہم پریم چند کے خوابوں کو پورا کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ اس موقعے پر معروف نقاد پروفیسر نامور سنگھ نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ پریم چند اردو ہندی دونوں زبانوں کے ادیب تھے لیکن ان کے کرداروں کی زبان اپنی ہوتی تھی۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہم خواب دیکھتے ہیں تو اپنی منزل کو پا بھی سکتے ہیں۔ پریم چند ہمیں جو خواب دے گئے ہیں ہمیں ان کی شمع روشن رکھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند سرمایہ داری نظام کے خلاف تھے اور انھیں یقین تھا کہ ہندوستان میں کبھی نہ کبھی سماج واد قائم ہوگا۔ اس سلسلے میں انھوں نے پریم چند کے افسانے ''لاٹری کا ٹکٹ'' اور'' منگل سوتر'' کا ذکر کیا۔ راجندر یادو نے اس موقع پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ بیرونی ممالک میں ادیبوں اور فنکاروں کے نام پر بڑی بڑی انجمنیں اور عمارتیں قائم کی گئی ہیں لیکن ہندوستان میں پریم چند جیسے عظیم نثر نگار کے نام پر ایک بھی انجمن قائم نہیں کی گئی ہے۔ انھوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ دہلی میں کسی بڑی سڑک کا نام پریم چند روڈ رکھا جائے نیز غالب انسٹی ٹیوٹ کی طرز پر کوئی ادارہ قائم کیا جائے جس میں پریم چند سے متعلق تحقیق کو فروغ دیا جائے۔ اس موقع پر مشہور شاعر اور ادیب زبیر رضوی نے کہا کہ پریم چند کو سمجھنے کے لیے معاشرے کو سمجھنا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ پریم چند عام آدمیوں کے نمائندہ تھے۔ مرلی منوہر پرساد سنگھ نے پریم چند کے افسانوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ پریم چند اپنے قلم کی مدد سے مظالم کے شکار عوام کا درد منظر عام پر لاتے تھے۔ انھوں نے ان کے افسانوں کو موجودہ دور کے تناظر میں سمجھنے پر زور دیا۔ فضیل جعفری نے کہا کہ افسانہ نگار مر جاتے ہیں لیکن ان کی حیت سالہا سال زندہ رہتی ہیں۔ اختتامی تقریب میں پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر دشو ناتھ ترپاٹھی، پروفیسر محمد حسن، اوم پرکاش والمیکی، شیو کمار مشرا، پربھا کھیتان، اجے ناوریا اور مرزا حامد بیگ نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اختتام پر سرلا مہیشوری نے تمام شرکا، مہمانان اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، نئی دہلی)

پروفیسر قمر رئیس دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئر مین

● نئی دہلی، 25 جولائی۔ معروف نقاد اور ادیب پروفیسر قمر رئیس کو دہلی اردو اکادمی کا وائس چیئر مین نامزد کیا گیا ہے۔ گورننگ کونسل میں چیئر پرسن وزیر اعلیٰ شیلا دکشت اور وائس چیئر مین کے علاوہ 24 ممبر نامزد کیے گئے ہیں جن میں سکریٹری آرٹ اینڈ کلچر اور لینگویجز اور پرنسپل سکریٹری (مالیات) بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ آٹھ دیگر ممبران خصوصی مدعوئین کے طور پر شامل کیے گئے ہیں۔ نئی گورننگ کونسل کے ممبران میں سید شریف الحسن نقوی، ڈاکٹر خلیق انجم، جوگیندر پال، رتن سنگھ، پروفیسر عبید الرحمن ہاشمی، پروفیسر شاہد حسین، مفتی عطاء الرحمن قاسمی، ڈاکٹر ارتضیٰ کریم، ڈاکٹر جمیل اختر، ڈاکٹر نجیب اختر، سید پرویز محمد شاہد خان، ڈاکٹر نگار عظیم، متین امروہوی، سید راشد حسین، اسرار قریشی، ڈاکٹر احرار حسین، ڈاکٹر اطہر فاروقی، ڈاکٹر جی وائی انجم، تلسی داس دوا، محترمہ عذرا سلطانہ اور ریاضت علی شائق شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خصوصی مدعوئین میں ڈاکٹر فریاد علی آزر، بدر منیر، مولانا محمد ساجد رشیدی، شمس رمزی، سید محمد ظفر علی، ظفر انور، ڈاکٹر خاور ہاشمی، اور سید رفیق الزماں کے نام شامل ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے جب خصوصی مدعوئین کے طور پر بھی ممبران شامل کیے گئے ہیں۔

اردو اکادمی کے سکریٹری سید مرغوب حیدر عابدی نے گورننگ کونسل کی تشکیل نو پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے امید ظاہر کی ہے کہ پروفیسر قمر رئیس کی قیادت میں نو تشکیل شدہ گورننگ کونسل اردو کی ترویج و ترقی اور دہلی اردو اکادمی کو اور زیادہ فعال بنانے میں اہم کردار ادا کرے گی اور اکادمی کے کام کاج میں مزید بہتری لانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

پنگوئین کا اردو کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ

● نئی دہلی، 27 جولائی۔ برطانیہ کے عالمی اشاعتی ادارے پنگوئین کے مقامی ایڈیٹر روی کمار کا کہنا ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے کہ اردو ایک ختم ہوتی ہوئی زبان ہے، اس لیے ان کے ادارے نے انگریزی کے بعد جب دیگر زبانوں میں کتابوں کی اشاعت کا فیصلہ کیا تو اردو کو اولین ترجیح دی۔ پنگوئین نے مشہور صحافی اور انگریزی روزنامہ ''کشمیر ٹائمز'' کے دہلی بیورو چیف افتخار گیلانی کی جیل ڈائری'' تہاڑ میں میرے شب و روز'' کے اجرا کے ساتھ اردو کتابوں کی اشاعت کی دنیا میں قدم رکھ رہی ہے۔ اس نے مستقبل میں انگریزی کی طرح ہی اردو میں بھی فکشن، ادبیات، تاریخ، سماجیات اور دیگر موضوعات پر بھی کتابیں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ آنے والے دنوں میں سابق وزیر اعظم پی وی نرسمہا راؤ'' ایودھیا'' پروفیسر شمس الرحمن فاروقی کا ناول'' کئی چاند تھے سر آسماں''، حبیب تنویر کی سوانح عمری'' مٹ میلی چدریا'' اور حمیرہ قریشی کی'' کشمیر'' وغیرہ کتابیں شائع کی جائیں گی۔ انھوں نے بتایا کہ اس وقت ہندوستان سے انگریزی کے بعد دوسرے نمبر پر اردو کی کتابیں ہی باہر جا رہی ہیں۔ روی کمار نے کہا کہ عالمی اشاعتی اداروں میں پنگوئین پہلا ادارہ ہے جو ہندوستان سے اردو میں کتابوں کی اشاعت شروع کر رہا ہے۔'' تہاڑ میں میرے شب و روز'' دراصل افتخار

گیلانی کی تہاڑ میں تقریباً سات ماہ کی قید و بند کے دوران ان پر گزرنے والے واقعات پر مبنی آپ بیتی ہے۔ (روز نامہ ''راشٹریہ سہارا'' دہلی)

''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' پر ممبئی یونیورسٹی میں مکالمہ

● ممبئی، 26 جون۔ ممبئی یونیورسٹی کے جے. پی. نائک بھون میں شعبۂ اردو کی جانب سے پروفیسر گیان چند جین کی کتاب ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' پر ماہر لسانیات پروفیسر عبدالستار دلوی کی صدارت میں ایک مکالمے کا اہتمام کیا گیا۔ مکالمے میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے سابق استاد ڈاکٹر اسلم پرویز، دہلی یونیورسٹی کے سابق استاد ڈاکٹر شریف احمد، صدر شعبۂ اردو، ممبئی یونیورسٹی ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے اور جناب ایوب واقف نے اظہار خیال کیا۔ معروف افسانہ نگار انور قمر، سلام بن رزاق، مقدر حمید کے علاوہ پروفیسر احمد انصاری، پروفیسر خورشید نعمانی اور معروف شاعر عبدالاحد ساز نے گفتگو میں حصہ لیا۔

ابتدا میں شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کے ڈاکٹر صاحب علی نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ دنوں پروفیسر گیان چند جین کی کتاب ''ایک بھاشا: دو لکھاوٹ، دو ادب'' بحث کا موضوع رہی ہے۔ اس پر ممتاز نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی کے علاوہ کئی دیگر حضرات کے تبصرے بھی آ چکے ہیں۔ چونکہ کتاب غیر معتبر اور کمزور حوالوں سے تیار کی گئی ہے اس لیے اس کے بیشتر مندرجات مفروضہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ چنانچہ ضرورت کتاب کے مندرجات کو تحقیق کے اصول و ضوابط پر پرکھنے اور معتبر حوالوں اور ٹھوس دلیلوں سے حقائق کو تلاش کرنے کی ہے۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے کہا کہ جب communication gap ہے تب مکالمے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ کتاب اس بات کا ثبوت ہے کہ جین صاحب اور ہمارے درمیان communication gap ہے۔ اس فاصلے اور اس کی وجہ سے معرض وجود میں آنے والی کتاب کو ہندو مسلمان کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ ہندی اردو کا بہت بڑا حلقہ ایک دوسرے سے قریب ہے۔ ہندی شاعری میں اردو کا ڈکشن آ رہا ہے، ہندی میں غزل مقبول ہو رہی ہے۔ خود ہندی والوں کا کہنا ہے کہ نثر لکھنا تو اردو والوں کو آتا ہے، ہندی والوں کو نثر لکھنی نہیں آتی۔ ایک بہت بڑا حلقہ ہے جو اردو اور ہندی کو قریب لانا چاہتا ہے۔ اس کتاب میں بہت سے مدعے (issues) گڈمڈ ہو گئے ہیں جن سے اندیشہ ہے کہ اس کے زیر اثر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خلاف ہو جائیں اور ان کے بیچ خلیج مزید گہری ہوتی جائے۔

پروفیسر شریف احمد نے کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا منطق سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اس میں بہت سی باتیں دل آزارانہ ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ جتنا تکلیف دہ ہے اتنا ہی ضروری بھی۔ اگر کتاب پڑھنے کا موقع نہ ملے تو شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا تبصرہ ضرور پڑھیں۔

ایوب واقف نے کہا کہ اس کتاب میں مسلم سلاطین کے بارے میں بھی غیر مصدقہ باتیں لکھی گئی ہیں جب کہ بشمبھر ناتھ پانڈے جو اڑیسہ کے گورنر تھے، اس ضمن میں شواہد کے ساتھ حقائق ہمارے سامنے رکھ چکے ہیں۔ جین صاحب نے سنی سنائی باتوں کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ مسلم ادیبوں نے غیر مسلم ادیبوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ ایوب واقف صاحب نے شواہد کے ساتھ اس الزام کی تردید کی۔ ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے نے کہا کہ پروفیسر گیان چند کی کتاب ایک بھاشا: ''دو لکھاوٹ، دو ادب'' ان کی پہلی غیر علمی کتاب ہے۔ اس کتاب سے ان کی آج تک کی باقی کتابوں کی نفی نہیں ہوتی۔ اس کتاب میں علمی موضوعات پر مفروضات کی بنیاد پر استدلال قائم کرتے ہوئے بحث کی گئی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات سے متعلق طرفین کی سائیکی میں تعصبات اور مفروضات پائے جاتے ہیں جن کی حیثیت واقعہ یا حقیقت کی نہیں ہے۔

معروف افسانہ نگار سلام بن رزاق نے کہا کہ میں نے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا تبصرہ اور سہ ماہی ''اردو ادب'' کا گوشہ دیکھا ہے۔ کتاب کے مشمولات مجھ تک ان دو وسائل سے پہنچے ہیں۔ اس میں تعصب سے پُر، حقائق کے برعکس باتوں کو حقائق کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کتاب جین صاحب کے امریکہ جانے کے بعد لکھی گئی ہو، ایسا نہیں معلوم ہوتا ہے۔ جین صاحب اسے لکھنے کا موڈ پہلے ہی بنا چکے تھے اور مواد اس نیت سے جمع کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر آنجہانی کالی داس گپتا رضا کے خط کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ سلام بن رزاق نے کہا کہ یہ اچھی بات ہے کہ ہم سب کتاب کے تعلق سے سنجیدہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں، صبر و تحمل سے کام لے رہے ہیں اور ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔

پروفیسر عبدالستار دلوی نے کہا کہ جین صاحب نے یہ کتاب تحقیق کے بنیادی اصول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے لکھی ہے۔ انھوں نے پہلے فیصلہ کر لیا کہ یہ نتیجہ ہوگا اور اس کی رعایت و مناسبت سے حقائق اور شواہد کو توڑ مروڑ کر استعمال کیا ہے۔ پروفیسر دلوی نے کہا کہ جین صاحب اردو اور ہندی کو ایک زبان قرار دیتے ہیں۔ یہ صرفی و نحوی تناظر کی حد تک درست ہے۔ ساختیات کی حد تک جو بات صحیح ہے اسے پوری لسانیات کے تناظر میں صحیح قرار دینا غلط ہے۔ جمالیات اور سماجی لسانیات کے تناظر میں یہ دو آزاد اور خود مکتفی زبانیں ہیں۔ پروفیسر دلوی نے اس بات پر بھی روشنی ڈالی کہ جین صاحب نے امرت رائے کی جس کتاب کا نام انتساب میں لکھا ہے خود اس کتاب میں بھی اردو سے متعلق حقائق کو توڑ مروڑ کر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اردو پر ہندی کی اولیت ثابت ہو جائے۔ امرت رائے اور جین صاحب اس ضمن میں سنتی کمار

چٹرجی کا حوالہ دیتے ہیں۔ علمی دیانتداری کا تقاضا تھا کہ یہ دونوں حضرات سنیتی کمار چٹرجی کا پورا حوالہ دیتے۔ آدھا حوالہ دے کر اردو پر ہندی کی اولیت ثابت کردی۔ جین صاحب اور امرت رائے، سنیتی کمار چٹرجی کا جو حوالہ استعمال کرتے ہیں سنیتی کمار چٹرجی نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنی تحریر میں اس کا ازالہ بھی کیا اور یہ کہا کہ اصل زبان تو اردو ہے۔ ہندی اردو کے جوتوں میں پیر رکھ کر چلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ آخر میں شعبۂ اردو کی استاد محترمہ معزہ قاضی نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

داغ دہلوی پر توسیعی خطبہ

● دربھنگہ، 18 جولائی۔ "نواب مرزا خاں داغ دہلوی دہلی کی ٹکسالی اردو کے معمار اول ہیں۔ ان کی ٹکسالی زبان نے اردو زبان کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کیا"۔ مذکورہ خیالات کا اظہار ممتاز نقاد اور شاعر پروفیسر لطف الرحمٰن نے ملت کالج، دربھنگہ کی جانب سے منعقدہ جلسے میں مرزا داغ دہلوی پر توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ پروفیسر لطف الرحمٰن نے اپنی تقریر میں میر، سودا، درد، جرأت، رنگین، انشا، آتش، ناسخ، ذوق، مومن اور غالب کے اسلوبیات کا جائزہ لیتے ہوئے داغ دہلوی کو اپنے اسلوب کا موجد قرار دیا۔ انھوں نے داغ کے ہمعصروں اور بعد کی نسل کے اسلوب پر داغ کے اثرات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ داغ نے اپنے منفرد لب و لہجے کی بدولت اردو شاعری کو وسیع پیمانے پر متاثر کیا جس کا اعتراف اردو کے تمام نامور ناقدوں نے کیا ہے۔ داغ دہلوی نے اردو شاعری کو عوام کی زبان بنانے کی کوشش کی اور اپنے تجربات اور مشاہدات کی بدولت اردو شاعری کی دنیا بدل دی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے اشتراک سے منعقد ہونے والے اس خطبے کا افتتاح پروفیسر بھولا پرساد سنگھ، پرووائس چانسلر متھلا یونیورسٹی نے کیا۔ پروفیسر سنگھ نے داغ کی شاعری کو ایک ایسی اردو کی بنیاد قرار دیا جسے صحیح معنوں میں ہندوستانی کہا جا سکتا ہے۔ جلسے کے مہمان خصوصی ڈاکٹر تنویر حسن نے اپنے تحریری پیغام میں داغ کی شاعری کو عوام الناس کے دلوں کی دھڑکن قرار دیتے ہوئے کہا کہ داغ دہلوی نے ناقابل فراموش لسانی خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ بہار پورے ملک میں اردو زبان و ادب کے فروغ کا اہم مرکز ہے لہٰذا یہاں اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تعلیم کو عام کیا جائے اور خصوصی طور پر بنیادی تعلیم کو لازمی بنایا جائے۔ اس توسیعی خطبے کے کنوینر ڈاکٹر مشتاق احمد، استاد شعبۂ اردو، ملت کالج، دربھنگہ نے آغاز میں مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے داغ دہلوی کی شاعری کا مختصر خاکہ پیش کیا۔ صدر جلسہ پروفیسر چودھری محمود عالم تھے۔ شکریہ پروفیسر ایس۔ ایم رضوان اللہ نے ادا کیا۔ (ڈاک سے)

ایک شام اختر الایمان کے نام

● پٹنہ، 2 اگست۔ معروف ادبی تنظیم علمی مجلس کی جانب سے یکم اگست کی شام گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ میں ایک مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف نقاد وہاب اشرفی نے کی جب کہ مہمان خصوصی کے طور پر ریاستی وزیر ڈاکٹر مناظر حسن موجود تھے۔ پروفیسر وہاب اشرفی نے کہا کہ اختر الایمان نے نظم نگاروں کے درمیان اپنے اسلوب و آہنگ کی انفرادیت سے وہ مقام حاصل کیا جو ان کے ہمعصروں میں کسی کو حاصل نہ ہوسکا۔ ڈاکٹر نسیم احمد نسیم نے کہا کہ اختر الایمان نے ترقی پسند تحریک اور حلقۂ ارباب ذوق کے رویوں سے الگ اپنی نئی راہ بنائی۔ ڈاکٹر مناظر حسن نے اختر الایمان کی جد و جہد بھری زندگی کے کئی گوشوں پر روشنی ڈالی۔ ادیب عبدالصمد نے بھی اس موقعے پر اظہار خیال کیا۔

جلسے میں "اختر الایمان کی شاعرانہ خدمات" کے موضوع پر مقابلۂ مقالہ نویسی کے کامیاب طلبہ و طالبات کو انعامات دیے گئے۔ اس محفل میں دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ عبد القیوم انصاری، بدیع الزماں سحر، شان الرحمٰن، انیس رفیع، شمویل احمد، سلطان اختر، اسریٰ ارشد، حسن نواب، عبید قمر، ظفر صدیقی، قوس صدیقی، احسان اشرف، امان اللہ شاد، اشرف یعقوبی، واحد نظیر، ظہیر سنگھ، شہزاد انور، منظر اعجاز، احمد رضا صدیقی، ناشاد اورنگ آبادی، نکہت مختار، ریحان غنی وغیرہ نے بھی جلسے میں شرکت کی۔ (ڈاک سے)

"فروغ اردو ادب" کے موضوع پر مذاکرہ

● حیدرآباد، 18 جولائی۔ کونسل برائے فروغ اردو صحافت و ذرائع ابلاغ اور بزم تشہیر کی جانب سے ایک مذاکرہ بعنوان "فروغ اردو ادب" کا 16 جولائی کو کانفرنس ہال اجوا ہوٹل پرانی حویلی میں سید شجاعت علی تجیع ڈائرکٹر پی آئی بی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ انھوں نے اردو زبان کی تاریخ اور اس کی مقبولیت، اردو ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں کی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو زبان کو ایک مخصوص مذہب کے ماننے والوں سے منسوب کرنا اردو زبان پر ظلم ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اردو کے ذریعے تعلیم حاصل کرنے والے بھی آج اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ انھوں نے خود اپنی مثال پیش کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کس طرح اردو ذریعۂ تعلیم سے اس مقام تک پہنچے۔ انھوں نے کہا کہ آج اردو بھی ایک کاروباری زبان بن چکی ہے۔ انھوں نے اردو کے صحافیوں سے گذارش کی کہ وہ پی آئی بی کی جانب سے شروع کی گئی۔ ان پیج کمپیوٹر کی تربیتی کلاسوں میں شرکت کرتے ہوئے اس سے استفادہ کریں۔ محمد شفیق اطہر

صدر نوین ہیلتھ یوتھ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی نے پی آئی پی کی جانب سے شروع کی جانے والی ترجیتی کلاس کا خیر مقدم کیا۔ حسن عابدی، حقائق عابدی، اقبال احمد اقبال، مگر ار عابدی، قاسم نہاں داور علی، تراب علی، تہنیت کرمانی، سجاد نظر، آغا اطہر، جواد شبیر، امانت نوابی، اکبر عابدی، میر تقی میر کے علاوہ دیگر مدعو شعرا نے کلام سنایا۔ جناب حسن عسکر نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

(روزنامہ ''منصف'' حیدرآباد)

انجمن ترقی اردو اتر پردیش کا جلسہ

● لکھنؤ، 8 جولائی۔ انجمن ترقی اردو اتر پردیش کی مجلس عاملہ کا ایک خصوصی جلسہ چودھری شرف الدین کی صدارت میں نعمت اللہ بلڈنگ، امین آباد، لکھنؤ میں منعقد ہوا، جس میں مہمانِ خصوصی کے طور پر ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو، ہند نے شرکت کی۔ جلسے میں مشہور ادیب اور صحافی احمد ابراہیم علوی، لکھنؤ یونیورسٹی میں پروفیسر شاہ عبدالسلام، پروفیسر شمس تبریز خاں، ڈاکٹر سید وکیل احمد ہاشمی، اسلم فاروقی، حسین امین، عثمان رضا، آفتاب اثر، معراج ساحل، رضوان فاروقی، رحمت لکھنوی، محمد وصی صدیقی اور انجمن کے صوبائی خازن شوق امروہوی اور قمر الحسن خاں وغیرہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اس بات پر زور دیا کہ اردو کے سلسلے میں احساسِ کمتری کو ختم کیا جائے اور اردو تحریک کو مدرسوں کے ساتھ جوڑا جائے۔

ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی تقریر میں نچلی سطح سے اردو کے لیے کام کرنے اور چھوٹے گروپ بنا کر قصبات اور دیہاتوں میں بھی کام کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے لیے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔

اس سے قبل انجمن ترقی اردو اتر پردیش کے جنرل سکریٹری محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ نے قرار داد پیش کرتے ہوئے حکومت سے مطالبہ کیا کہ ریلوے کے اوقات، منی آرڈر فارم، ووٹر لسٹ اور دیگر سرکاری دستاویزات اردو میں شائع کیے جائیں اور اردو خبروں کا ایک مزید بلیٹن دور درشن سے نشر کیا جائے۔ انھوں نے حکومت اتر پردیش سے مطالبہ کیا کہ ہر ضلعے میں کم سے کم ایک اردو میڈیم اسکول یا انٹر کالج کھولا جائے اور تمام سرکاری و نیم سرکاری اداروں میں سہ لسانی فارمولا پوری طرح سے نافذ کیا جائے۔ جلسے میں اردو صحافی عبدالقدوس قادری کو انجمن ترقی اردو اتر پردیش کے شعبۂ نشر و اشاعت کا سکریٹری مقرر کیا گیا۔ جلسے کی نظامت محمود الظفر رحمانی نے انجام دی۔ آخر میں چودھری شرف الدین نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

علامہ اقبال کے یوم پیدائش کو عالمی یوم اردو منانے کی اپیل

● نئی دہلی، 22 جولائی۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا نے علامہ اقبال کے یوم پیدائش 9 نومبر کو عالمی یوم اردو کے طور پر منانے کی اپیل کی ہے۔ تنظیم نے عالمی یوم اردو کے انعقاد کے سلسلے میں ایک میٹنگ کی جس کی صدارت سینئر صحافی سید خالد حسین (سنگا پور) نے کی۔ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال وہ شخصیت ہیں جنھوں نے سب سے پہلے بین الاقوامی سطح پر اردو زبان کا لوہا منوایا۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی حقیقی ترقی اور ترویج و اشاعت کے خواہاں افراد کو عملی طور پر میدان میں آنا چاہیے اور 9 نومبر کو عالمی یوم اردو کا اہتمام کرنا چاہیے۔ عالمی یوم اردو آرگنائزنگ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خاں نے بتایا کہ مختلف ممالک میں جہاں اردو بڑے پیمانے پر رائج ہے، وہاں کی معروف شخصیات کو عالمی یوم اردو منانے کے لیے خطوط ارسال کیے گئے ہیں۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

نازش پرتاپ گڑھی کی یاد میں جلسہ

● پرتاپ گڑھ، 25 جولائی۔ مرحوم شاعر نازش پرتاپ گڑھی کے یوم پیدائش پر ان کے صاحبزادے محمد انیس کی قیام گاہ واقع اسٹیشن روڈ پر ایک ادبی نشست منعقد ہوئی جس کی صدارت عبدالمنان نے کی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی نازش پرتاپ گڑھی کے شاگرد اور آکاش وانی الہ آباد کے پروگرام آفیسر لوکیش شکلا نے ان کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات یاد کرتے ہوئے ان کی غزلیں پیش کیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ نازش پرتاپ گڑھی کو سابق صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے 1984 میں غالب ایوارڈ سے سرفراز کیا تھا۔ حب الوطنی اور قومی یکجہتی ان کی شاعری کا سب سے اہم موضوع ہیں۔ انھوں نے قومی یکجہتی اور انسانی اقدار کی حفاظت کے لیے اپنے قلم کا بھرپور استعمال کیا۔ وہ 10 اپریل 1984 کو ہم سے جدا ہو گئے۔ اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اس موقعے پر اکرم الہ آبادی، نور پرتاپ گڑھی، رونق پرتاپ گڑھی، عارف جونپوری، طلحہ تابش، عمران خاں وغیرہ موجود تھے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

سہیل احمد زیدی کی یاد میں جلسہ

● دہلی، 23 جولائی۔ تحریک ادب اسلامی ہند کی نامور شخصیت اور مشہور شاعر ڈاکٹر سہیل احمد زیدی کی یاد میں ادارۂ ادب اسلامی ہند کی تعزیتی نشست ماہنامہ ''پیش رفت'' بارہ دری بلیماران دہلی میں منعقد ہوئی جس کی صدارت بزرگ شاعر ابوالمجاہد زاہد نے اور نظامت جنرل سکریٹری ادارۂ ادب انتظار نعیم

نے کی۔ انتظار نعیم نے ڈاکٹر سہیل احمد زیدی کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے دعائے مغفرت کی۔ انجینئر خلیق الزماں نے ان کے فن اور شخصیت پر ایک مضمون بہ عنوان ''میں کھو گیا تو اہل فن میں دستیاب ہو گیا'' پیش کیا۔ صدر ادارۂ ادب اسلامی ڈاکٹر سید عبدالباری شبنم سبحانی نے کہا کہ ڈاکٹر سہیل احمد زیدی ادارۂ ادب اسلامی، الہٰ آباد کے بنیاد گزار تھے جنھوں نے باقاعدہ ماہانہ نشستوں کا اہتمام بڑی پابندی کے ساتھ کیا جن میں مشہور ناقد جناب شمس الرحمٰن فاروقی بھی گاہ بہ گاہ شریک ہوتے تھے۔ ان میں شعرا کے علاوہ کثیر تعداد میں سامعین کی شرکت بھی ہوتی تھی۔ اس موقعے پر قمر سنبھلی، ابوالمجاہد زاہد، وقار مانوی، ڈاکٹر ظفر مرادآبادی، شہباز ندیم ضیائی، حسنین سائر، سید عبدالباری شبنم سبحانی، مخدوم زادہ مختار عثمانی اور وقار کیفی نے اپنا کلام پیش کیا۔
(ڈاک سے)

ایک شام پی پی سریواستو رند کے نام

● نئی دہلی، 8 جولائی۔ غالب اکیڈمی بستی حضرت نظام الدین میں مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی اور نوئیڈا کی ادبی تنظیم ''سرجن'' کی جانب سے ایک شام جناب پی پی سریواستو رند کے نام منعقد کی گئی۔ پروگرام کا آغاز نسیم دعا پوری کی نعت پاک سے ہوا۔ پروگرام کے پہلے دور کی صدارت ڈاکٹر مہیش شرما نے کی۔ اس موقعے پر حاضرین نے مرحوم ڈاکٹر فرید احمد اور مرحوم رئیس رامپوری کو دو منٹ خاموش کھڑے ہو کر خراج عقیدت پیش کیا۔ جلسے کی نظامت ایم سلیم نے کی۔ رند صاحب کا تعارف جناب رؤف رامش نے کرایا اور جناب رفعت سروش نے مقالہ پیش کیا۔ مظہر امام اور رفعت سروش نے مجموعہ کلام ''جاگتی تنہائیاں'' کا اجرا کیا۔ مولانا محمد علی جوہر اکیڈمی اور سرجن کی جانب سے رند صاحب کو شال اور شیلڈ پیش کی گئی۔ اخبار لٹریری فورم کی جانب سے ہفت روزہ ''اخبار نو'' کے منیجنگ ایڈیٹر مودود صدیقی نے رند صاحب کو گیارہ ہزار روپے کا چیک پیش کیا۔ پروفیسر اختر الواسع اور ڈاکٹر مہیش شرما نے جلسے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد جناب تنویر وصفی ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نوئیڈا کی صدارت میں مشاعرہ منعقد ہوا جس میں جناب ڈی سی پانڈے (نظر کانپوری) نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ سید شکیل حسن شمسی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ جن شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا ان کے اسمائے گرامی ہیں: مظہر امام، رفعت سروش، تنویر وصفی، نظر کانپوری، نصرت گوالیاری، پی پی سریواستو رند، فصیح اکمل، طالب رامپوری، واحد سحری، شکیل حسن شمسی، حسن کاظمی، متین امروہوی، معین شاداب، ڈاکٹر ذکی طارق، شہباز ندیم ضیائی، مخدوم زادہ مختار عثمانی، رؤف رامش اور راجیش شکل یجن۔
(ڈاک سے)

انیس اعظمی کے اعزاز میں نشست

● ممبئی، 11 جون۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، (انجمن خیرالاسلام اسکول کرلا ممبئی سینٹر) میں گزشتہ دنوں معروف ڈراما نگار جناب انیس اعظمی کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے ممبئی کے نوجوان ڈراما نگار اور کہانی کار اسلم پرویز بھی موجود تھے۔ صدارت پرنسپل انوار خاں نے اور نظامت خان رشید اشرف ساحل نے کی۔ اقبال نیازی نے انیس اعظمی اور اسلم پرویز کا تفصیلی تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اردو ڈراما اور تھیٹر کی یہ دو بے حد اہم اور فعّال شخصیتیں ہیں، ڈرامے کے فن پر دونوں کی زبردست گرفت ہے۔ اقبال نیازی نے انیس اعظمی کے فن اور شخصیت پر ایک مضمون بھی پڑھا۔ جناب انیس اعظمی نے اپنی تقریر میں طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کی تہذیب کو اپنایا ہے اور اس اعتبار سے تھیٹر ہمارے مشترکہ کلچر کی نمائندگی کا اہم ذریعہ ہے۔ ڈراما لکھنے کے لیے اس کی پوری کیفیت، اسٹیج کرافٹ، عمیق مشاہدہ بے حد ضروری ہے۔ انھوں نے اس بات کی شکایت کی کہ ''اردو تھیٹر کے ڈراموں کو ٹکٹ لے کر دیکھنے کی روایت اب نہیں رہی، پارسی تھیٹر کے عہد میں یہ روایت تھی کہ لوگ ٹکٹیں خرید کر بار بار ڈرامے دیکھنے جاتے تھے۔'' انیس اعظمی نے ڈراما کے فن کی ابتدا یونان سے لے کر مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے ہندوستانی ڈراما، مختصر ڈراما یک بابی ڈراما کی پیش کش، بچوں کے ڈرامے، ڈراما کی زبان، اداکاری کی اہمیت، وغیرہ متعدد موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور طلبہ کے سوالات کے جوابات دیے۔

اسلم پرویز جو اردو، ہندی اور گجراتی تھیٹر سے بھی منسلک ہیں نے اس بات کی شکایت کی کہ اردو تھیٹر اس لیے نہیں پنپ رہا ہے کہ اردو ڈراما کے ناظرین نہیں رہے۔ انھوں نے کہا کہ امتیاز علی تاج کا شہرۂ آفاق ڈراما ''انار کلی'' آج تک اسٹیج نہیں ہو سکا اس کی کئی وجوہات ہیں جن میں ڈرامے کا پر شکوہ سیٹ، قیمتی لباس کی تیاری، صحیح اردو بولنے والے اداکاروں کا فقدان اور کثیر سرمائے کا خرچ جیسے کئی مسائل حائل رہے۔'' اس ادبی نشست میں اساتذہ اور طلبہ کی بڑی تعداد موجود تھی۔
(ڈاک سے)

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کولکاتا سینٹر کا سالانہ ادبی و ثقافتی مقابلہ

● کولکاتا، 13 جولائی۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کولکاتا اسٹڈی سینٹر مسلم انسٹی ٹیوٹ میں طلبہ تنظیم 'بزم ادب' کی جانب سے سالانہ ادبی و ثقافتی مقابلہ 2006 کا انعقاد نیاز احمد خاں ہال میں کیا گیا جس میں چیف کوآرڈینیٹر پروفیسر نعیم انیس، پروفیسر سلیمان خورشید، توقیر اعظم، پروفیسر شمشیر

عالم، مشتاق احمد، شمشاد عالم، صفدر مرزا، جاوید اختر، اصغر انیس، نیلوفر نبی، شاہدہ نصرت، رومانہ علی، تبسم مرزا، محمد مشتاق، محمد یوسف بحیثیت جج شریک ہوئے۔

بی اے سال اول، دوم اور سوم کے طلبہ و طالبات نے غزل خوانی اور فی البدیہہ میں کافی تعداد میں حصہ لیا۔ ایم اے کے طلبہ بھی تمام پروگراموں میں شامل تھے۔

غزل خوانی گروپ اے میں کامیاب ہونے والے طلبہ سرفراز احمد (اول) محمد اقبال (دوئم) محمد ظفر اقبال (سوئم) نظم خوانی گروپ اے میں شہباز انور (اول) محمد اقبال (دوئم) محمد واجد علی خاں (دوئم) محمد اقبال (سوئم) غزل خوانی گروپ بی افروز عالم (اول) جلال احمد انصاری (دوئم) نظم خوانی گروپ (بی) محمد شاہد اقبال (اول) محمد شمیم (دوئم) فی البدیہہ گروپ (بی) محمد شاہد اقبال (اول) محمد ایوب انصاری (دوئم) علی فردوس (سوئم) تھے۔ (روزنامہ ''آبشار'' کولکاتہ)

علامہ اقبال پر آٹھواں کل ہند تحریری مقابلہ

● بھوپال۔ علامہ اقبال ادبی مرکز، ساہتیہ اکادمی کی جانب سے قومی سطح پر علامہ اقبال پر آٹھواں کل ہند تحریری مقابلہ منعقد کیا جارہا ہے۔ اس مقابلے میں ہندوستان کی تمام یونیورسٹیوں/کالجوں کے طلبہ شرکت کر سکتے ہیں۔ مقالے کا موضوع ''علامہ اقبال کے کلام میں ہندوستانی عظیم ہستیاں'' ہے۔

خوشخط تحریر شدہ مقالہ 25 ستمبر، 2006 تک مرکز کے دفتر میں موصول ہو جانا چاہیے۔ پتہ یہ ہے: ساہتیہ اکادمی، مدھیہ پردیش سنسکرتی پریشد، ملا رموزی سنسکرتی بھون، بان گنگا روڈ، بھوپال۔ 462003 (ڈاک سے)

تقسیم اسناد کے جلسے

● رانچی، 6 جولائی۔ قومی اردو کونسل کی جانب سے مہیلا دستکاری ودیالیہ، شمیم آباد، اٹکی، رانچی میں چلائے جارہے یک سالہ اردو ڈپلوما کورس کا جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا جس کے مہمان خصوصی عزت مآب سید سبط رضی گورنر جھارکھنڈ تھے۔ مہمان اعزازی کے طور پر محترمہ چاند فرحانہ، ڈی اے وی اسکول گروپس کے ڈائرکٹر جناب ایل آر سنہا اور اپولو ہاسپٹل رانچی کے چیئرمین جناب منظور احمد انصاری موجود تھے۔ اس موقعے پر جناب سبط رضی نے کہا کہ اردو زبان محبت کا سرچشمہ اور اتحاد و اتفاق کی نشانی ہے۔ زبان انسانوں کے درمیان نفرتوں کا دائرہ پیدا نہیں کرتی ہے۔ زبان انسان کے خیالات کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ اگر ہم کسی زبان کو مذہب کے ساتھ جوڑتے ہیں تو یہ عمل اس زبان کے ساتھ ہماری بدترین زیادتی اور ناانصافی ہوگی۔ سید سبط رضی نے اپنی تقریر میں کہا کہ زبان کو کسی مذہب سے جوڑنا اس زبان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اس موقعے پر ڈپلوما کورس ان اردو ٹکنالوجی کے بینر تلے قرب و جوار کے سبھی اسکولوں کے ایک ایک ہونہار طالب علم کو نقدی انعام سے نوازا گیا۔ جلسے کی صدارت شمیمہ خاتون انصاری نے کی اور شکریہ پروفیسر جمال انجم نے ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● شاہجہاں پور، 12 جولائی۔ قومی اردو کونسل کی جانب سے چلائے جا رہے شہید اشفاق اللہ خاں انفوٹیک کمپیوٹر سینٹر میں ایک سالہ کمپیوٹر ایپلیکیشن اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کورس کے فارغین کے لیے جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا جس میں مہمان خصوصی کے طور پر جناب مہیش چند نوٹیال (سی۔جے۔ایم۔ شاہ جہانپور) شریک ہوئے اور طلبہ و طالبات کو اسناد تقسیم کیں۔ اس تقریب کی صدارت معروف شاعر جناب مبارک شمیم نے کی۔ (ڈاک سے)

جلسۂ تہنیت برائے طلبہ

● پونے، 15 جولائی۔ حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے کی جانب سے ایس.ایس.سی اور ایچ.ایس.سی. امتحانات برائے 2006 میں پونے ضلعے کے اردو مدارس اور اقلیتی کالجوں کے ذہین اور امتیازی نمبرات سے کامیاب ہونے والے طلبہ کو اعظم اسکالرشپ ہدیۂ تہنیت پیش کرنے کی غرض سے ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اعظم ٹرسٹ کی جانب سے ہر سال اردو مدارس کے سرفہرست پندرہ طلبہ کو ان کی تعلیم مکمل ہونے تک اعظم اسکالرشپ دی جاتی ہے جس کے نتیجے میں کئی طلبہ اپنی تعلیم مکمل کر کے کامیاب پیشہ ورانہ زندگی گذار رہے ہیں۔ اس مرتبہ طلبہ کی رہنمائی کے لیے شکیل شیخ (اردو ٹائمز) اور عامر انصاری (انقلاب) کے زیر نگرانی پیشہ ورانہ رہنمائی کے خصوصی پروگرام کو بھی شامل کیا گیا۔ متور پیر بھائی چیئرمین، حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ نے اس پروگرام کی غرض و غایت بیان کی اور ممتاز پیر بھائی نے مہمان خصوصی عمران فرنیچر والا کا تعارف پیش کیا۔ عمران فرنیچر والا نے طلبہ کو چنوتیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کی تلقین کی اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں علم و عقل کا بخوبی استعمال کرنے کی صلاح دی۔ بعد ازاں کامیاب طلبہ کو انعامات و اعزازات سے نوازا گیا۔ جناب زبیر آر شیخ، سکریٹری حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، کے رسم شکریہ پر جلسے کا اختتام ہوا۔ (ڈاک سے)

مشاعرہ

● جالندھر، 17 جولائی۔ بھابیہ اسپتال نزد گردوارہ بندہ بہادر میں ایک شعری نشست اردو کلب، جالندھر جس کے صدر ڈاکٹر جے ٹی بھابیہ ہیں کے زیر اہتمام منعقد ہوئی۔ اس پروگرام کی صدارت رئیس کرتار پور جناب جوگندر

سنگھ اور نظامت صبا جمالی نے کی۔ جناب پرتھی سنگھ اور ڈسٹرکٹ اسپورٹس آفیسر سرکھ سنگھ مہمان خصوصی تھے۔اس میں جن شعرائے کرام نے شرکت کی ان کے نام ہیں۔

جناب ایم ایم خان غازی،صبا جمالی،عارف گوبند پوری،خورشید احمد خورشید، ہربنس راہی،وید پرکاش چویڑا،جی ایس اولکھ،سرودیال کرتار پوری اور اسلم راہی وغیرہ۔ آخر میں جے نی بھاٹیہ نے اپنی اختتامی تقریر میں حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ہند سماچار جالندھر)

جانے والوں کی یاد

حیات لکھنوی

● نئی دہلی۔ حیات لکھنوی ایک خوش فکر شاعر ہی نہیں ایک نیک دل اور دوست نواز انسان بھی تھے۔ ان خیالات کا اظہار دلی کے ایک تعزیتی جلسے میں کیا گیا۔ حیات لکھنوی کو جن کا 15 اگست کو رات ساڑھے آٹھ بجے لکھنؤ میں 75 سال کی عمر میں انتقال ہو گیا،خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مخمور سعیدی نے کہا کہ ان کی موت سے اردو کی ادبی محفلوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کا پر ہونا آسان نہیں، وہ جس تہذیبی فضا کے پروردہ تھے وہ اب خواب وخیال ہو کر رہ گئی ہے ان کے تین شعری مجموعے ''حصار آب''،''ندی کے پار کا منظر'' اور ''وسیلہ'' قبول عام کی سند پا چکے ہیں۔ روایتی شاعری سے جدید لب ولہجہ کی شاعری تک کا سفر انھوں نے بڑی کامیابی سے کیا تھا۔

حیات لکھنوی نے اپنی عملی زندگی کا آغاز دلی سے نکلنے والے انگریزی اخبار ہندوستان ٹائمز سے کیا تھا، پھر وہ نیشنل ہیرالڈ میں آ گئے اور یہیں سے سبکدوش ہوئے۔ سبکدوشی کے بعد بھی وہ دلی ہی میں رہے دو مہینے پہلے وہ لکھنؤ گئے تھے جہاں ان کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انتقال کے وقت وہ ایک نرسنگ ہوم میں داخل تھے۔ تعزیتی جلسے میں مخمور سعیدی کے علاوہ نصرت ظہیر، چندر بھان خیال، فاروق ارگلی اور موسیٰ رضا نے بھی اظہار خیال کیا۔

محمد یونس ہرگانوی

● پٹنہ۔ممتاز صحافی، معلم اور شاعر محمد یونس ہرگانوی کا 12 جون 2006 کو ایک بجے دن میں پٹنہ میں انتقال ہو گیا۔ان کی عمر تقریباً 70 سال تھی۔ وہ کچھ دنوں سے علیل تھے۔ ان کی پیدائش نالندہ ضلع کے موضع ہرگانواں میں ہوئی تھی۔ محمد یونس ہرگانوی کی تعلیم مدرسہ اسلامیہ، رانچی اور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں ہوئی۔ ان کے ساتھیوں میں پروفیسر عبدالمغنی، پروفیسر ابوذر عثانی اور پروفیسر شمیم احمد صدیقی قابل ذکر ہیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد بی این کالجیٹ اسکول پٹنہ میں اردو فارسی کے استاد ہوئے اور اسی اسکول سے 1996 میں سبکدوش ہوئے۔

ان کا شمار کامیاب اساتذہ میں ہوتا تھا صحافت سے ان کا گہرا شغف رہا۔ وہ مختلف اخبارات سے منسلک رہے۔ غلام سرور کے اخبار ''سنگم'' سے ان کی گہری وابستگی تھی۔ غلام سرور کے جیل چلے جانے کے بعد بھی ان کی محنت و صلاحیت کے سبب یہ اخبار اسی آب وتاب سے نکلتا رہا۔ انھوں نے اس اخبار میں کالم نویسی بھی کی۔

ان کے مضامین مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ''اماوس کے تارے'' ان کی زندگی میں ترتیب پا چکا تھا۔محمد یونس ہرگانوی کو اردو فارسی، عربی کے علاوہ ہندی اور انگریزی پر بھی دسترس حاصل تھی۔ انھوں نے درجنوں درسی کتابیں لکھیں۔ انھوں نے ہندی سے اردو تراجم کی خدمات بھی انجام دیں۔ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور آٹھ بیٹیاں ہیں۔ مرحوم کا قائم کردہ اشاعتی وطباعتی ادارہ دانشکدہ دریا پور، سبزی باغ، پٹنہ ہے جو ان کے بیٹے کی نگرانی میں چل رہا ہے۔ (ڈاک سے)

سید سراج الدین

● حیدرآباد، 18 جولائی۔ پروفیسر سید سراج الدین ایک صاحب نظر دانشور تھے۔ان کا اردو کے علاوہ فارسی اور انگریزی ادب کا مطالعہ بہت گہرا تھا۔اقبال سے انھیں خاص شغف تھا۔ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید سراج الدین کے سانحۂ ارتحال پر منعقدہ تعزیتی جلسے میں مقررین نے کیا جس کا انعقاد اقبال اکیڈمی حیدرآباد اور اسلامک ہیریٹیج فاؤنڈیشن نے کیا۔ اس جلسے کی صدارت محمد ظہیر الدین نائب صدر اقبال اکیڈمی نے کی۔ پروفیسر تقی علی مرزا نے کہا کہ پروفیسر سراج کا مطالعہ وقیع تھا۔ ان کو کئی زبانوں پر عبور اور شغف تھا۔ پروفیسر تقی نے اقبال اکیڈمی سے گزارش کی کہ وہ پروفیسر سراج کے ''جاوید نامہ'' کے ترجمے کی اشاعت کا اہتمام کرے۔ پروفیسر بیگ احساس نے کہا کہ وہ غلو کو پسند نہیں کرتے تھے اور تنقید کو قبول کرتے تھے۔ مظفر مجاز، ڈاکٹر یوسف اعظمی، مولانا سلیمان سکندر، مولانا محمد عبدالرحیم قریشی، محمد عمر علی خاں اور محمد ظہیر الدین نے بھی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔محمد ضیاء الدین نیر معتمد اکیڈمی نے اس جلسے کی نظامت کی۔

□□□

تبصرہ و تعارف

کلیات حسن نعیم/احمد کفیل

صفحات: 335، قیمت: -/185 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ۔ 6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

مبصر: عبدالرب، 252، سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی۔ 110067

''کلیات حسن نعیم'' کی تدوین و ترتیب نوجوان محقق احمد کفیل کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس سے قبل موصوف کی ایک کتاب ''حسن نعیم اور نئی غزل'' 2002 میں منظر عام پر آ چکی ہے۔ نئی غزل کے پیش روؤں میں حسن نعیم ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ یگانہ کے بعد جس شاعر نے غزل کو بانکپن عطا کیا وہ حسن نعیم ہی ہیں اور اس لحاظ سے ان کی شاعری اردو کی غزلیہ روایت میں انفرادیت کی حامل ہے۔ انھوں نے تمام عمر مصلحت سے گریز کیا اور اسی کو اپنا شعار بنایا۔

کچھ اصولوں کا نشہ تھا کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے

ان کی زندگی اسی شعر کی تفسیر ہے اور ان کی غزل نئی غزل کی تعمیر میں خاصی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کلیات تین حصوں میں منقسم ہے مثلاً ''سرمایۂ غزل''، ''اشعار پریشاں'' اور ''متفرقات''۔ ''سرمایۂ غزل'' کے تحت حسن نعیم کے تینوں شعری مجموعوں میں شامل غزلیں یکجا کر دی گئی ہیں۔ مرتب نے حصۂ اوّل کو ان مجموعہ ہائے کلام کی اشاعت کے اعتبار سے تین ادوار میں اس طرح تقسیم کیا ہے۔ پہلا دور ''اشعار'' اور 71-1950 کے درمیان کی غزلیں۔ دوسرا دور ''غزل نامہ'' اور 80-1972 کے درمیان کی غزلیں، تیسرا دور ''دبستان'' اور 91-1981 کے درمیان کی غزلیں۔ بعض ایسی غزلیں بھی مرتب کو مختلف رسائل و جرائد میں دستیاب ہوئی ہیں جو حسن نعیم کے کسی مجموعۂ کلام میں شامل نہیں ہیں، مرتب نے ان غزلیات کو بھی مع تاریخی ترتیب بطور ضمیمہ شامل اشاعت کیا ہے۔

دوسرے حصے میں ''اشعار پریشاں'' کے تحت دستیاب نامکمل غزلوں کو جگہ دی گئی ہے۔ ان غزلوں کی جملہ تعداد 37 ہے۔ کلیات کا آخری حصہ ''متفرقات'' پر مشتمل ہے جس میں حسن نعیم کی جملہ دستیاب نظمیں، مثنویاں اور قطعات کو یکجا کر دیا گیا ہے۔

کلیات کے ابتدائی صفحات میں بھرپور مقدمے اور حسن نعیم کی توقیت کے علاوہ حسن نعیم کی شاعری اور فکر و فن سے متعلق خلیل الرحمن اعظمی، مخمور جالندھری، راجندر منچندا بانی اور ڈاکٹر خلیق انجم کے مضامین بھی شامل ہیں جو حسن نعیم کی شاعری کی تفہیم میں ممد و معاون ہیں۔ احمد کفیل نے کلیات حسن نعیم کی ترتیب و تدوین میں جس بالغ نظری اور تحقیقی ذہن سے کام لیا ہے اس سے امید بندھتی ہے کہ مستقبل میں بھی وہ اس طرح کے وقیع کارنامے انجام دیتے رہیں گے۔

کلیات حسن نعیم کی اشاعت کے ذریعے کونسل نے ایک اہم ضرورت پوری کی ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں قومی اردو کونسل کی اس گرانقدر پیش کش کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

توبۃ النصوح (ناول)/ڈپٹی نذیر احمد

صفحات: 175، قیمت: -/75 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ۔ 6، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 110066

مبصر: شہاب ظفر اعظمی، شعبۂ اردو، پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ۔ 800005

توبۃ النصوح ڈپٹی نذیر احمد کا تیسرا ناول ہے جو پہلی بار 1877 میں شائع ہوا۔ اس سے پہلے ان کے دو ناول ''مرأۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کی ہمارے کلاسیکی ادب میں خاص اہمیت رہی ہے اس لیے یہ تقریباً تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ مگر کلاسیکی ادب کی صحت متن کے ساتھ اشاعت اور امدادی کتب و لغات کی کمی کی وجہ سے اکثر اساتذہ و طلبہ دونوں ہی اس کی صحیح تفہیم سے بے بہرہ رہ جاتے ہیں اور قدیم و جدید ادب کے درمیان جو صرفی، نحوی، لسانی اور تہذیبی فرق ہے اسے سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ فکری، معاشرتی، تمدنی اور زمانی فرق بھی ہے جس سے عدم واقفیت کی وجہ سے آج کے طالب علم اپنے قدیم ادبی ورثے سے بے خبر ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی کمی کو دور کرنے کے لیے قومی اردو کونسل نے کلاسیکی ادب کو از سر نو شائع کرنے کا ایک بڑا منصوبہ بنایا ہے۔ ''توبۃ النصوح'' کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

"توبتہ النصوح" پلاٹ، کردار نگاری، مکالمے اور زبان و بیان ہر لحاظ سے بہت دلچسپ ناول ہے۔ اس ناول کا موضوع تربیت اولاد ہے۔ مصنف نے یہ بات ذہن نشیں کرانے کی کوشش کی ہے کہ اولاد کی پرورش کے ساتھ ساتھ ان کی بہتر تربیت بھی والدین کی ذمہ داری ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی کو ایسا نمونہ بنائیں جو اولاد کے لیے قابل تقلید ہو۔ ڈپٹی نذیر احمد یہ ناول سب کے لیے لکھنا چاہتے تھے لیکن بقول خود کسی ایک خاندان کا انتخاب تو کرنا ہی تھا۔ چنانچہ ایک مسلم گھرانے کا انتخاب کیا۔

قصہ یوں ہے کہ ایک مسلم خاندان کا سربراہ (نصوح) ایک دفعہ ہیضے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ معالج خواب آور دوا دیتا ہے جس کے اثر سے وہ سو جاتا ہے۔ موت کا خوف عالمِ خواب میں روزِ محشر کا نقشہ پیش کر دیتا ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو وہ اپنے زندہ ہونے پر خدا کا شکر بجا لاتا ہے اور سارے خاندان کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیتا ہے۔ اس مشن کی تکمیل میں اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور خاندان کے پختہ عمر کے افراد (جن کی عادتیں پختہ ہو چکی تھیں) اس کے راستے میں سب سے زیادہ رکاوٹیں ڈالتے ہیں مگر بالآخر اسے کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ البتہ بڑا بیٹا کلیم کسی بھی طرح راہ راست پر نہیں آتا اور لڑ جھگڑ کر اپنے دوست ظاہر دار بیگ کے گھر چلا جاتا ہے مگر وہاں شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ آخر میں فوج میں بھرتی ہو کر زخمی ہوتا ہے اور مر جاتا ہے۔

نصوح، کلیم اور ظاہر دار بیگ اس ناول کے مرکزی کردار ہیں جن کے ارد گرد ہی پورا پلاٹ گھومتا ہے۔ مصنف کو نصوح سے زیادہ دلچسپی ہے مگر دانستہ یا نادانستہ سب سے پرکشش اور جاندار کردار کلیم کا ہو گیا ہے جو ایک رندِ لاابالی بھی ہے اور دلدادۂ حسن بھی۔ وہ دین و مذہب سے بیگانہ ہے مگر علم و فن سے بیگانہ نہیں۔ وہ طبعاً غیر مقلد اور مجتہدانہ اوصاف کا مالک ہے۔ مصیبتیں جھیلتا ہے مگر اپنی رائے پر قائم رہتا ہے۔ دوسرے کرداروں میں ظاہردار بیگ اور نعیمہ بھی پرکشش ہیں۔ کلیم کے انجام کے متعلق تشویش رہتی ہے اس لیے ناول میں تجسس کا عنصر بھی ہے جو اصلاحی موضوع ہونے کے باوجود اسے دلچسپ بنا دیتا ہے۔ زبان تھوڑی مشکل اور پیچیدہ ہے اور محاورات کثرت سے استعمال کیے گئے ہیں مگر اندازِ بیان ایسا ہے کہ قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ قومی اردو کونسل نے اسے شائع کر کے طالب علموں کی ایک بڑی ضرورت پوری کر دی ہے۔

خطباتِ آزادی (قبل آزادی کانگریس کے صدارتی خطبات) حصہ اوّل

صفحات: 580، قیمت: -/200 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، ونگ۔6، آر کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

مبصر: شاذیہ عمیر، 5/A نورانی باغ کالونی، پوسٹ گلزار باغ، پٹنہ۔ 800007

زندہ قوم کی پہچان یہ ہے کہ وہ حال اور مستقبل کے ساتھ ماضی کے سرمائے پر بھی نظر رکھتی ہے تاکہ گزرے ہوئے واقعات و تجربات کی روشنی میں اپنی بقیہ زندگی کا لائحہ عمل مرتب کر سکے۔ ہمارا ملک ایک طویل عرصے تک انگریزوں کا غلام رہا۔ یہ بات ہمارے نونہالانِ وطن کو بھی معلوم ہے لیکن ملک کو اس غلامی سے نجات دلانے کے لیے ہمارے اسلاف نے کتنی قربانیاں دیں، کتنے مصائب جھیلے اور کیسی کیسی اذیتیں برداشت کیں اس سے بھی ہم سب کو واقف ہونا چاہیے اور آنے والی نسلوں کو بھی واقف کرانا چاہیے۔ قومی اردو کونسل نے کانگریس کے 1921-1947 تک کے صدارتی خطبات جو قبل آزادی کے مختلف مقامات اور مختلف اوقات میں دیے گئے تھے، "خطباتِ آزادی" (حصہ اول) کے نام سے از سرِ نو شائع کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار اتر پردیش اردو اکادمی نے شائع کی تھی۔

ملک کی آزادی کی جنگ چونکہ کانگریس کی قیادت میں لڑی گئی اس لیے ان خطبات کی بے حد اہمیت ہے۔ اس کتاب میں حکیم اجمل خاں، سی آر داس، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر مختار احمد انصاری، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، نیتا جی سبھاش چندر بوس اور آچاریہ جے بی کرپلانی کے صدارتی خطبات یکجا کر دیے گئے ہیں۔

انگریز سیاسی طور پر قابض ہونے کے ساتھ معاشی، اقتصادی، سماجی، تہذیبی اور ثقافتی یہاں تک کہ مذہبی معاملات میں بھی دخل اندازی کو اپنا فرض اولین تصور کرنے لگے تھے۔ ہندوستانی باشندوں کے لیے اپنی مرضی سے سانس لینا بھی دو بھر ہو گیا تھا نتیجتاً یہاں کے عوام اور ہمارے رہنماؤں نے آگے بڑھ کر حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا خصوصاً کانگریسی لیڈروں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے اور جو قربانیاں دیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ در اصل یہ رہنمایانِ قوم مکمل آزادی سے ہٹ کر انگریزوں کی پیش کردہ کسی اور تجویز پر راضی ہی نہیں ہوئے۔ سی آر داس کا وہ خطبہ جو 1921 میں بطور کانگریس صدر قوم کے نام پیش کیا، اس کے چند جملے ملاحظہ کیجیے:

"آزادی تو میرا فطری حق ہے اور میں اس حق کے تسلیم کیے جانے کا مطالبہ کرتا ہوں۔ میں بالاقساط یا حصے بخرے کر کے اس حق کو تسلیم کرانا نہیں

چاہتا بلکہ میں تو اس بات کا مطالبہ کرتا ہوں کہ اس حق کو بالکلیہ اور تمام وکمال منظور کرلیا جائے مجھے اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ فتح ہماری ہوگی لیکن فرض کیجیے کہ ہم ناکام بھی رہیں تو بھی کم از کم اتنا تو ضرور ہوگا کہ ہمارے قومی وقار اور ہماری قومی منزلت کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے گا۔ ہم جس طرح ہوگا اس ذلت کو سر سے اتار دیں گے جس قانون پر حکومت ہند کی بنیاد ہے۔" ص 24

مزید گاندھی جی نے اپنی تقریر میں اس بات پر انتہائی زور دیا کہ ہندو لڑکوں اور لڑکیوں کو اس بات کی تعلیم دی جائے کہ ہندو دھرم کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکا اور انسانیت کے خلاف بہت بڑا جرم ہے۔ نیز کانگریس کو کھادی اور چرخے کی طاقت پر اعتماد ہونا چاہیے اور یہ کہ عدم تشدد ہی آزادی حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے کیوں کہ وہ لوگ جو تشدد پر یقین رکھتے ہیں ان کے نزدیک ہندوستان کی ترقی میں روڑے اٹکانے والے لوگ ہیں۔ اس لیے اگر ان کے دلوں میں کروڑ ہا فاقہ کش انسانوں کے لیے رحم یا ہمدردی کا ذرہ برابر بھی جذبہ موجود ہے تو یہ لوگ تشدد کی وکالت نہیں کر سکتے۔ ان کے خیال میں ہندوستان تشدد کے عقائد کے لیے موزوں سرزمین نہیں ہے۔ ہندوستان مسلمہ طور پر عدم تشدد کا بہترین ترجمان اور خزینہ ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ کانگریس ہندوستان میں عوام کی حکومت کا مطالبہ کرتی ہے اور جمہوری نظام کے لیے جدو جہد کر رہی ہے۔ یہ سامراج کی دشمن ہے اور سیاسی و اقتصادی نظام میں بڑی تبدیلیوں کے لیے کوشاں ہے لہٰذا انھوں نے اپنی اس امید کا اظہار کیا کہ واقعات کے اسباب اور نتائج اسے سوشلزم کی طرف لے جائیں گے کیوں کہ ان کے نزدیک ہندوستان کی خستہ حالت کا صحیح علاج صرف یہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ انھوں نے اس بات کا بھی اعادہ کیا کہ ہمارے لیے سب سے ضروری اور اہم مسئلہ ہندوستان کی مکمل آزادی اور عوام کی حکومت کا قیام ہے۔ اس لیے کانگریس کو تمام دنیا کے آگے بڑھنے والی قوتوں کے ساتھ ہو کر دنیا میں امن قائم رکھنے کی حمایت کرنا چاہیے۔

مولانا ابوالکلام کا خطبہ بھی کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں۔ انھوں نے یہ بانگ دہل اس بات کا اعلان کیا کہ ہندوستان کو آزادی تبھی حاصل ہوگی، جب تعمیری پروگرام میں ہندو مسلم اتحاد کی تبلیغ کا کام از سر نو شروع کیا جائے۔ ملک کی مزدور جماعتوں کی تنظیم کو نظر انداز نہ کیا جائے کیوں کہ ان سے غافل ہو کر آئندہ کوئی بھی کام نہیں کیا جا سکتا اور یہ کہ عوام کی سیاسی تعلیم، تحریر و تقریر کے ذریعہ سے اپنی جدو جہد کی گذشتہ سرگرمی میں تیاری،..... یہ سب کام بیک وقت ہونا چاہیے۔ اس لیے موجودہ وقفہ میں اس سے غفلت کیے بنا کوشش کرنی چاہیے تاکہ قومی اتحاد، عدم تعاون، عدم تشدد اور سول ڈس اوبیڈینس کے اصول و مقاصد عوام کے دلوں پر ایسے نقش ہو جائیں کہ وہ اسے محض کسی مذہبی خوش اعتقادی کی بنا پر نہیں بلکہ خالص جذبۂ حب الوطنی سے اپنا فرض سمجھ کر کام کریں۔

نیتا جی سبھاش چندر بوس کا خیال یہ تھا کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" پالیسی کھلے فوائد تو ضرور رکھتی ہے مگر حکمراں طاقت کے لیے اس میں برکت ہرگز نہیں۔ یہ پالیسی لازمی طور پر نئے مسائل اور نئی پریشانیاں پیدا کرتی معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ برطانیہ عظمیٰ اپنی تفریق کی پالیسی سے پیدا ہونے والی سیاسی دو رنگی کے جالوں میں خود پھنس رہا ہے۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کو خوش کرے یا ہندو کو، فلسطین میں عربوں کو نوازے یا یہود کو، مصر میں بادشاہ کی طرف ہو یا وفد کی طرف، اس کی یہی دو رنگی سلطنت کے باہر بھی نمایاں ہے۔

علاوہ ازیں مولانا محمد علی جوہر، حکیم اجمل خاں، مسز سروجنی نائیڈو اور دوسرے کانگریسی رہنماؤں کے صدارتی خطبات بھی اسی نوعیت کے ہیں جن کے مطالعے سے قبل آزادی ہندوستان کے مسائل اور ان کے حل کے لیے جو کاوشیں کی گئیں وہ پوری طرح واضح ہو کر ہمارے سامنے آ جاتی ہیں۔ بلاشبہ یہ خطبات آزادی ہماری موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لیے ایک قیمتی وراثت ہیں۔ اگر اس کا دوسرا حصہ بھی شائع ہو کر منظر عام پر آ جائے تو یہ ایک بہتر کام ہوگا۔

جویندہ یابندہ — حیات کمیونزم اور سب کچھ

مصنف: رالف رسل/ ارجمند آرا

ناشر: سٹی پریس، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی (پاکستان)

ہندوستان میں ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ، اردو بازار، دہلی۔ 110006

صفحات: 468، قیمت: -/259 روپے

مبصر: ابوبکر عباد، شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی، دہلی۔ 110007

ہمارے اردو داں حضرات اکثر اصناف میں بے اعتدالیوں کا شکار ہوتے اور بیشتر اوقات قاری کو صحیح فن پارے کی قرأت سے محروم اور فن کے تئیں ابہام میں مبتلا کرتے رہے ہیں۔ اس کی واضح مثالیں حقیقت پسندی کے نام پر لکھے جانے والے بہت سے بے مقصد اور غیر منطقی افسانوں کے علاوہ علامت نگاری اور تجریدیت کے شوق میں لکھی جانے والی لایعنی اور مبہم کہانیوں کے علاوہ ان پر شائع ہونے والی تنقید کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ ترجمے کے ضمن میں بھی خراب چیزوں کے اچھے اور اچھی چیزوں کے خراب تراجم یا بعض اوقات اس نام پر تلخیص، تحریف یا اصل سے مشابہ الفاظ کے مجموعے کو جس انداز سے پیش کیا گیا اس کی غیر سنجیدگی اہل علم حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے، لیکن سب سے زیادہ افراط و تفریط کا جبر جس صنف کو سہنا پڑا وہ ہے سوانح یا خود نوشت سوانح حیات۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ فکشن کی فرضی داستان کا فرضی کردار پچانوے فیصد کہانیوں میں سچ بولتا،

دلیری سے حقائق کا سامنا کرتا اور اپنے خالق کی اطاعت سے انکار کرتا ہے، جب کہ سوانح میں زندگی کے حقائق پر مبنی واقعات کا حقیقی راوی اکثر کتابوں میں جھوٹ بولتا، اپنی انا کی اطاعت کرتا اور حقائق کی پردہ داری کرتا ہے، یہ جانتے ہوئے کہ سوانح نام ہے سچ بولنے اور واقعات کو جوں کا توں اس طور پیش کرنے کا کہ صاحب سوانح کی سیرت و شخصیت پوری طرح واضح ہو جائے۔

انگریزی میں برٹرینڈ رسل اور اردو میں مرزا غالب اپنی سوانحی تحریروں اور خطوط میں اپنے متعلق بڑی بیباکی، سادگی اور صفائی سے وہ ساری باتیں بتا دیتے ہیں جنھیں دوسرے شاعر و ادیب صیغۂ راز میں رکھنے کی حتی الامکان کوششیں کرتے ہیں۔ برٹرینڈ رسل خود پر جان دینے والی ایک حاملہ محبوبہ کو چھوڑ دینے کی بات تک بلا جھجک بتا دیتے ہیں اور غالب کی ستم پیشہ ڈومنی اور اس کی پرعیش بدمستی سے سب واقف ہیں، اور ایک یہی واقعہ کیا، غالب نے اپنی تحریروں میں اپنی کسی کمی، کمزوری اور (بقول اشرافیہ) کمینگی تک کو نہیں چھپایا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب غالب اور اردو کے ایک انگریز مداح رالف رسل کی خود نوشت سوانح حیات کی پہلی جلد ہے، جس میں مصنف نے خود پر گزرنے والے تمام واقعات کو دیانت، سچائی اور کمال سادگی سے بیان کیا ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نہ تو اخلاقی قدروں میں محصور ہے اور نہ اپنی امیج پر آنچ آنے دینے کے بارے میں محتاط۔ یہ نہ تو اپنے عقیدے کا کٹر مقلد ہے اور نہ آئیڈیالوجی کا اندھا موکل۔ اسے اپنے اندر کے آدمی کو سر عام جوں کا توں پیش کرنے سے پرہیز نہیں۔ وہ انسانی خوبیوں اور خامیوں سے متصف ایک ایسا شخص ہے جو ایمانداری سے بچپن کی یادوں، لڑکپن کی باتوں، بلوغیت کی منزل کے جنسی تلذذ کے احساسات، نوجوانی کی دوستی اور عشق کے واقعات اور ذہنی اور فکری رویوں کی تبدیلیوں کو بڑے سہج طریقے سے بیان کرتا اور قاری کے سامنے اپنی شخصیت اور واقف کاروں کے خود سے متعلق پوشیدہ رازوں سے پردے اٹھاتا چلا جاتا ہے۔ یوں جیسے جیسے مصنف کی زندگی کا سفر آگے بڑھتا ہے اس کی ذات اور شخصیت کی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں، اور کتاب کے اختتام پر گویا وہ ہم سے کہتا ہے لیجیے صاحب اب تک کی میری زندگی بھی اسی کتاب کی مانند کھلی ہے جسے آپ نے شوق سے پڑھا اور ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں نے آپ سے نہ تو کچھ چھپایا، نہ ہی کوئی جھوٹ بولا۔

یہ کتاب صرف مصنف کی زندگی اور اس کے دوستوں اور شناساؤں کے انتہائی نجی معاملات کے ذکر پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس کے عہد و معاشرے بھی اس میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ رالف رسل کی نوجوانی کے دور میں یورپ پر دوسری جنگ عظیم کا خطرہ منڈلا رہا تھا اور عام لوگ اور خصوصاً باشعور لوگ سخت بے چینی کا شکار تھے۔ اسی دور میں رالف رسل برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ ہو گئے اور انسانی حقوق اور قدروں میں بے پناہ یقین نے انھیں محکوم قوموں، مظلوم لوگوں اور استحصالی نظام کے مطالعے کی طرف راغب کر دیا۔ طالب علم کے طور پر وہ اپنے اسکول اور بعد میں کالج میں بڑے جوش و خروش سے طلبہ تنظیم کے لیے کام کرتے تھے جس کا کام انسانی حقوق کے تئیں بیداری لانا اور جنگ مخالف محاذ تیار کرنا تھا۔ اس طرح رالف رسل کی داستان زندگی گویا انگلینڈ کے نوجوان ذہن اور جنگ کے تئیں اس کے موقف کی بھی داستان ہے۔ فوج میں لازمی بھرتی کے بعد ایک افسر کے طور پر رالف رسل نے کئی برس ہندوستان کے شمال مشرقی علاقے میں، برما کی سرحد کے قریب گزارے اور برما سے ہو کر ہندوستان کی سرحد پر جاپانی حملے کی کوششوں کو بڑے قریب سے دیکھا اور جنگ کی ہولناکیوں کے اثرات بھی کوہیما میں خود دیکھے۔ انھوں نے ان تمام واقعات کا مشاہدہ ایک بیدار مغز اور سیاسی شعور کے حامل شخص کے طور پر کیا اور بڑے سلیقے سے انھیں اپنی سوانح میں بیان کیا ہے۔ انھوں نے اپنے فوجی یونٹ کے ہندوستانی سپاہیوں میں سیاسی بیداری لانے کے لیے بڑا خطرہ مول لے کر مسلسل کام کیا اور ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کو اس سے باخبر رکھا۔ ان کوششوں کی تفصیلات بھی بڑی دل چسپ ہیں۔ اس طرح ان کی سوانح عمری برصغیر ہند و پاک کی سیاسی، سماجی صورت حال، متعدد قد آور شخصیات، اہم واقعات اور تحریکوں پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ تاہم کتاب میں ایک کمی جو بری طرح کھلتی ہے وہ ہے واقعات کی بہتات، اگر انتخاب سے کام لیا جاتا تو یہ سوانح زیادہ جامع اور پر اثر ہوتی۔

انگریزی میں لکھی اس کتاب کا ترجمہ ڈاکٹر ارجمند آرا نے کیا ہے۔ ارجمند آرا انگریزی اور ہندی زبانوں سے اچھی واقفیت رکھتی ہیں اور دہلی یونیورسٹی میں اردو کی استاذ ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ انھوں نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ الفاظ کے دروبست، جملوں کی ساخت، محاوروں اور فقروں کے متبادل کے استعمال اور ربط و تسلسل کو قائم رکھنے میں انھوں نے اس سلیقے اور ہنرمندی سے کام لیا ہے کہ یہ کتاب انگریزی کے ترجمہ کی بجائے عمدہ اردو نثر کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔

حیرت فروش (افسانے)/غضنفر

صفحات: 238، قیمت: -/200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: محمد زماں آزردہ، سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لنگویجز، میسور، کرناٹک

غضنفر عہد حاضر کے فکشن نگاروں میں اپنی جگہ مستحکم کر چکے ہیں۔ یوں تو ہر شخص ایک عمر میں خواب دیکھتا ہے، خواب بنتا ہے، خوابوں کی تعبیر سوچتا ہے

اور آگے بڑھتا رہتا ہے مگر متواتر خواب دیکھنا اور انھیں اپنے پڑھنے والوں کے سامنے تعبیر کے لیے پیش کرنا ان گنے چنے لوگوں کا کام ہے جو شعر گوئی یا فکشن رائٹنگ کا سلسلہ جاری رکھتے ہیں۔ غضنفر شعر بھی خوب کہتے ہیں، بچوں کے لیے بھی لکھتے رہے ہیں مگر جس چیز کے لیے وہ زیادہ تر جانے، پہچانے اور یاد کیے جائیں گے وہ ان کی فکشن رائٹنگ ہے، خصوصاً ناول نویسی جس میں انھوں نے کافی وقت صرف کیا اور چھ ناول اب تک شائع ہو چکے ہیں حال ہی میں ان کی کہانیوں کا ایک مجموعہ ''حیرت فروش'' شائع ہوا ہے جس میں 33 کہانیاں شامل ہیں۔ یہ کہانیاں ایک ایسے آدمی کی زندگی سے متعلق تاثرات ہیں جو کھلی آنکھ سے دیکھتا اور پختہ ذہن سے سوچتا ہے۔ لوگ عموماً دور کی کڑیاں ملاتے ہیں۔ دوسروں کی تصویر میں دیکھتے ہیں، جب دوسرا کوئی سامنے ہو تو کسی تیسرے آدمی کی بات کرتے ہیں۔ مگر اپنی بات کرنا، اپنے مخاطب کو ٹوکنا اور تیسرے آدمی کے بارے میں خاموش رہنا یہ غضنفر جیسے ادیب ہی کر سکتے ہیں۔ وہ اپنے بارے میں سوچتے ہیں اور اپنے مخاطب کو بتاتے ہیں۔

ان کے موضوعات متنوع ہیں۔ ان کا زندگی کا تجربہ اس قدر وسیع ہے کہ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنے خون میں اتارتے ہیں جب یہی خون دماغ میں گردش کرتا ہے تو بیسیوں کہانیاں جنم لیتی ہیں۔ ان کی کہانیاں ہماری آپ کی اس صدی کی کہانیاں ہیں، ان میں رومان، روٹی، کپڑا اور مکان، بے روزگاری اور روزگار کا کوئی ذکر نہیں۔ اگر کہیں کسی طرح کا ذکر آ بھی جائے تو دوسرے خیالات کے Association کے سبب سے آتا ہے جو مرکزی خیال کی صورت اختیار نہیں کرتا۔

غضنفر کی کہانیاں حیرت اور استعجاب کا لبادہ ضرور اوڑھے ہوئے ہیں، مگر یہ ان کا ذاتی استعجاب نہیں رہتا۔ وہ کسی طبقے کی نمائندگی نہیں کرتے بلکہ انسانی زندگی اور خاص طور سے آج کی انسانی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان کی کہانی ''خالد کا ختنہ'' محض خالد کی کہانی نہیں رہتی، یہ گجرات کے فسادات تک محدود نہیں رہتی، یہ حیدر آباد، سندھ، پشاور اور لاہور کے مناظر بھی سامنے لاتی ہے۔ یہ محض ایک انسان، ایک قوم یا ایک مجبور شخص کی داستان نہیں رہتی بلکہ ایک بچے کے آئینہ میں پورے ایشیا کی تصویر پیش کرتی ہے۔

ان کی کہانی ''بھیڑ چال'' سیدھے سادے عام ایشیائی لوگوں کے اندر کا کرب سامنے لے آتی ہے۔ جب ''دور بین'' پڑھتے ہیں تو ایک آن میں امریکی حکام اور ''بن لادن''، پاکستانی حکمران اور ''طالبان''، ہندوستانی حکمران اور ''بندرن والا'' وغیرہ آنکھوں کے سامنے گھوم کے رہ جاتے ہیں۔ انسان اپنے آپ کے گرد حصار کھینچنے کے لیے سانپ پالتا ہے، جب یہ سانپ اپنی اصلی قوت پا لیتے ہیں تو انھیں اپنے پالنے والوں کو ڈسنے میں کسی سے حکم نامہ نہیں لینا پڑتا۔ بے شک وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لیے مالک کے حکم کے تابع رہتے ہیں، لیکن مالک کو ڈسنے کے لیے انھیں کسی حکم، کسی تحریک یا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں رہتی۔

غضنفر ابھی اتنے سن رسیدہ نہیں جتنے وہ اپنی کہانی ''مسنگ مین'' میں نظر آتے ہیں مگر شاید انھیں آنے والے وقت کا اندازہ بہت پہلے سے ہو گیا ہے اور یوں ہماری عمر کے لوگوں کی ترجمانی بہت اچھی طرح سے کی ہے۔

دینی مدارس اور عہد حاضر کے تقاضے

مصنف: غلام یحییٰ انجم

صفحات: 208، قیمت: -/150 روپے

ناشر: مرکز اہل سنت برکات رضا، امام احمد رضا روڈ، پوربندر (گجرات)

مبصر: ایس۔اے۔رحمٰن، 1669، کوچہ دکھنی رائے، دریا گنج، نئی دہلی۔2

مدارس کی اہمیت و ضرورت اور ان کی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان میں رہ کر بچے اعلیٰ سماجی اقدار اور جینے کے سلیقے سیکھ سکتے ہیں۔ دینی مدارس کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ یہاں مذہبی تعلیم اساس ہوتی ہے اور زندگی کے سلیقے اور قرینے مذہبی تعلیم کی روشنی میں اجاگر کیے جاتے ہیں۔ مذہب اور عقیدہ ہر فرد کی زندگی کا لازمی جزو ہوتا ہے بشرطیکہ وہ دہریہ نہ ہو۔ اسلامی تعلیم کے حوالے سے دینی مدارس ہمیشہ فعال رہے ہیں لیکن حالیہ دنوں میں مدارس نکتہ چینی کی زد میں آ گئے ہیں۔ ان پر دہشت گردی کی تربیت کے الزامات لگے ہیں جب کہ آزادی سے پہلے ان کی کارکردگی مثبت قدروں کی عکاس رہی ہے۔ مدارس نے مجاہدین آزادی بھی دیے ہیں اور اصلاح معاشرہ کا کارنامہ بھی سرانجام دیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند ہو یا سہارنپور کا مظاہر العلوم، دہلی کا مدرسہ امینیہ ہو یا بہار شریف کا مرکز دینی تعلیم یا اتر پردیش، بہار، نیپال کی ہندوستانی سرحد پر پھیلے دینی مدارس، ان تمام دینی اداروں میں 'آدمی' کو 'انسان' بنانے کا عمل جاری ہے۔ اردو زبان کی بقا اور فروغ میں مدارس کا اہم کردار رہا ہے۔ چونکہ یہ دینی مدارس میں تدریس کی زبان ہے۔ دینی مدارس کی یہ خدمت قابل قدر ہے کہ یہاں اردو کی بنیادی تعلیم کا چلن قائم و دائم ہے۔ زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم کا وہ تحقیقی مقالہ ہے جن میں انھوں نے عہد حاضر کے تقاضوں کے حوالے سے دینی مدارس کا جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر انجم دینی نظام تعلیم کے تربیت یافتہ ہیں اور جامعہ ہمدرد سے وابستہ ہیں۔ یہ کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں ''دینی مدارس: آغاز و ارتقا'' کے حوالے سے تعلیم کی ضرورت اور دینی تعلیم، نصاب تعلیم، درس نظامی

اور دینی مدارس کی اہمیت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ دوسرے باب میں دینی نصاب تعلیم کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے دینی مدارس کے بنیادی نقائص کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس میں مروجہ نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلم یونیورسٹی کے نصاب دینیات پر بھی گفتگو کی گئی ہے اور عربی و فارسی بورڈ کے جدید نصاب کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ تیسرے باب میں دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم کی شمولیت پر مصنف نے دلائل کے ساتھ زور دیا ہے کیونکہ آج کی زندگی کی ضرورتیں سائنس کی مدد کے بغیر پوری نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے عصری تقاضوں کے پیش نظر مدارس کے نصاب میں تبدیلی اور اس میں سائنسی ٹکنیکی اور سماجی تعلیم کی شمولیت ضروری ہے۔ چوتھے باب میں دینی مدارس کے نصاب اور کارکردگی میں رد و بدل کے تعلق سے کچھ تجویزیں رکھی گئیں ہیں جن کو اپنا کر اور نصاب میں سائنس کے مضامین، سماجی علوم، انگریزی اور ہندی کو شامل کر کے دینی مدارس تدریسی سطح پر عہد حاضر کے تقاضے پورے کر سکتے ہیں اور یہاں کے سند یافتہ عام زندگی میں دوسری درسگاہوں کے افراد کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چل سکتے ہیں۔ اپنے موضوع پر یہ ایک اہم کتاب ہے۔ جس کے ذریعے ''موجودہ تقاضوں کے مطابق اسلام کو سمجھانے کی مستحسن کوشش کی گئی ہے۔'' اس کتاب میں مصنف نے دینی تعلیم کے نصاب میں انگریزی، ہندی، اردو، سائنس اور سماجی علوم کے مضامین کی شمولیت کی وکالت کی ہے اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔

سہ ماہی ''جہانِ غالب'' مدیر: عقیل احمد

صفحات: 160، قیمت: -/20 روپے

ناشر: غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔ 110013

مبصر: نوشاد عالم، 243 سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی۔ 110067

دہلی کی معروف ادبی انجمن غالب اکیڈمی کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے کا یہ دوسرا شمارہ ہے جو چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ ''تفہیم غالب'' کا ہے جس کے تحت پروفیسر شارب ردولوی کا مضمون ''تفہیم غالب اور شرح غالب'' شامل ہے۔ اپنے اس مضمون میں مقالہ نگار نے شرح و تعبیر اور لفظ و معنی کے داخلی رشتوں اور باطنی مماثلتوں کو بڑے دلنشیں انداز میں بیان کیا ہے۔ غالب کی شرح و تعبیر کتنی مشکل ہے اس پر محاکمہ کرتے ہوئے غالب کا وہ آسان شعر نقل کیا ہے جس کی تشریح میں لوگوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں اور وہ بھی محض اس احساس کی وجہ سے کہ یہ شعر غالب کا ہے۔ ملاحظہ کریں۔

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خاک کہ گلخن میں نہیں

مقالہ نگار غالب کی شرح کے لیے فارسی زبان و ادب اور روایات کے علم اور اپنی روایات سے واقفیت کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

دوسرے حصے میں ''غالب کی نثر'' ہے۔ اس کے تحت پانچ مضامین شامل ہیں جن سے غالب کی نثر نگاری کی مختلف جہات روشن ہوتی ہیں اور ان کی نثر کے سلسلے میں ایک جامع نقطۂ نظر سامنے آتا ہے۔

پہلا مضمون ''مکاتیب غالب میں طنز و مزاح'' پروفیسر قمر رئیس کا ہے۔ دوسرا مضمون ''خطوط غالب اور جدید نثر'' ڈاکٹر اوصاف احمد کا ہے۔ تیسرا مضمون ''خطوط غالب کی نثر'' پروفیسر قاضی جمال حسین کا ہے۔ چوتھا مضمون ''غالب کی نثر چند گذارشات'' ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کا ہے۔ پانچواں مضمون ''تفہیم غالب بذریۂ خطوط غالب'' ڈاکٹر ابن کنول کا ہے۔ متذکرہ جملہ مضامین اپنے موضوعات کا پورا احاطہ کرتے ہیں اور اردو نثر میں مرزا غالب کی انفرادیت کو قائم کرتے ہیں۔

تیسرا حصہ ''تنقیدی مقدمات'' کا ہے۔ اس حصے میں ڈاکٹر شمس بدایونی کا مضمون ''غالب تنقیدی مقدمات کے تناظر میں'' شامل ہے۔ فاضل مقالہ نگار نے کلام غالب پر لکھے گئے تین مقدمات، مقدمۂ بجنوری، مقدمہ محمود غازی پوری اور سید شاکر حسین سہسوانی کے مقدموں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اول الذکر دو مقدمے غالب کی عظمت و اہمیت کو اجاگر کرتے ہیں جب کہ آخر الذکر مقدمے میں غالب کے کلام کو اس لائق ہی تصور نہیں کیا گیا کہ ان کا مقابلہ مومن و ذوق کے کلام سے کیا جا سکے کیونکہ شاکر سہسوانی مقابلے اور موازنے کے لیے تین نسبتوں کا ذکر ضروری خیال کرتے ہیں۔ اول نسبت حرفت، دوم تساوی مذاق سوم اتحاد طریق و اختلاف یا اتفاق مقصد اور ان تینوں نسبتوں کا مذکورہ بالا شعرا کے یہاں فقدان ہے۔ مصنف نے بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے محاکمہ کرتے وقت بجنوری و شاکر سہسوانی کی افراط و تفریط کو پیش نظر رکھا ہے جو ان دونوں نے تفہیم غالب کے سلسلے میں روا رکھی ہے۔

چوتھا اور آخری حصہ ''جہان غالب بعد از ان غالب'' ہے۔ پروفیسر ظہور الدین کا تحریر کردہ مضمون اردو غزل 1900 سے 1957 تک اس حصے کی زینت بڑھاتا ہے۔ اس میں غزل کے ارتقا کی کہانی بڑے دلنشیں پیرائے میں بیان کی ہے۔

□□□

حیدر بیابانی | ہماری مطبوعات سے | ”بے زبانوں کی دنیا“ سے ماخوذ

الیکشن

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انہیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے بخوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

”بے زبانوں کی دنیا“ حیدر بیابانی کی نظموں کا مجموعہ ہے جس میں مختلف جانوروں، پرندوں اور دیگر حشرات الارض کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس کتاب میں چوہا، بلی، خرگوش، تتلی، شیر، گھوڑا، گدھا، مور، چیونٹی، ہاتھی، شیر، شہد کی مکھی اور دیگر جانداروں پر بے حد دلچسپ نظمیں شامل ہیں جو بچوں کو یقیناً پسند آئیں گی۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ 128 صفحات کی اس کتاب کی قیمت 29 روپئے ہے۔ کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45 فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد خصوصی رعایت دیتی ہے۔

جنگل میں ہے الیکشن
ہوتے ہیں روز فنکشن
ہاتھی کھڑا ہوا ہے
چرچا بڑا ہوا ہے
ہوتا ہے شور اتنا
ہاتھی کا زور اتنا
پنڈال کو لگائے
بینر وہ خود اٹھائے
چنگھاڑتا ہے ہاتھی
گپ جھاڑتا ہے ہاتھی
کہتا ہے ”میں کھڑا ہوں
ہر ایک سے بڑا ہوں
ہے نام میرا ہاتھی
میں آپ کا ہوں ساتھی
آؤں گا کام سب کے
کرتب مرے غضب کے
تم مجھ کو ووٹ دینا
بدلے میں نوٹ لینا“

○

شیر

ہے شیر ایک لیڈر
چرچے ہیں اس کے گھر گھر
ایسی دہاڑ مارے
سب کو پچھاڑ مارے
گھر گھر ہے اس کی آمد
کرتا ہے وہ خوشامد
ندیاں پھلانگتا ہے
وہ ووٹ مانگتا ہے
گھومے ہے رات ساری
راجا بنا بھکاری
میٹنگ اس نے لی ہے
تقریر خوب کی ہے
ساری برائیوں سے
توبہ کیا ہے اس نے
سب سامنے کہا ہے
جو کچھ کہ مدعا ہے
کہتا ہے شیر سب سے
”میں کہہ رہا ہوں کب سے
دشمن کو یار کر لوں
میں سب سے پیار کر لوں
کردوں معاف سب کو
بانٹوں لحاف سب کو
جنگل کی مشکلوں کو
ڈر خوف سے دلوں کو
اب دور میں دھروں گا
انصاف میں کروں گا
کر لو مرا سلکشن
جیتوں گا میں الیکشن“

○

خرگوش

خرگوش بھی ڈرتا ہے
پرچار میں لگا ہے
کل فارم وہ بھرے گا
کسی سے نہیں ڈرے گا
ننھی سی جان اس کی
اونچی اڑان اس کی
مضبوط ہیں ارادے
کرتا ہے خوب وعدے
کہتا ہے وہ سبھی سے
''ڈرتا نہیں کسی سے
کر لوں گا کام ایسا
ہو میرا نام ایسا
میں ہوں غریب بندہ
مانگوں نہیں میں چندہ
کھاؤں نہیں میں رشوت
کم ہے مری ضرورت
سب کے لیے جیوں گا
سب کے لیے مروں گا
تم مجھ کو چن کے لانا
ہرگز نہ ہچکچانا''

○

چیتا

چیتا چناؤ میں ہے
کچھ دن سے تاؤ میں ہے
چیخیں وہ مارتا ہے
سب کو پکارتا ہے
تعویذ ہے گلے میں
''امید'' حوصلے میں
کہتا پھرے وہ سب سے
''ڈرنا مرے غضب سے
جنگل میں مجھ سے بڑھ کر
کوئی نہیں ہے لیڈر
سب کا ہوں چہیتا
ہے نام میرا چیتا
خرگوش کیا کرے گا
وہ خوف سے مرے گا
ہاتھی میں عقل کم ہے
پتھر کا وہ صنم ہے
خونخوار شیر سب کو
کر دے گا زیر سب کو
سب سوچ کر سمجھ کر
دو ووٹ تم برادر
مجھ کو ہی چن کے لانا
تم ووٹ مت گنوانا''

○

جب ہو چکا چناؤ
کم ہو گیا تناؤ
چپ ہو گئے ہیں سارے
کچھ دن یوں ہی گزارے
گنتی کا وقت آیا
خوابوں میں تخت آیا
گنتی شروع ہوئی ہے
چپ سب نے سادھ لی ہے
اعلان ہو گیا ہے
راجا نیا بنا ہے
خرگوش چن کے آیا
کل ووٹ اس نے پایا
حیرت میں سب پڑے ہیں
پھول ہار لے کھڑے ہیں
بچے کا بول بالا
جھوٹوں کو سب نے ٹالا
شرما رہا ہے ہاتھی
پچھتائیں اس کے ساتھی
اب شیر دم دبائے
پھرتا ہے منہ چھپائے
چیتا کہیں چھپا ہے
وہ چوٹ کھا گیا ہے
ہوگی نئی حکومت
خرگوش کی قیادت
ننھے کا راج ہوگا
سر اس کے تاج ہوگا
بے خوف سب رہیں گے
بے ٹوک سب کہیں گے

□□□

مراسلات اور مضامین صاف اور خوش خط ارسال فرمائیں۔
(ادارہ)

28 جولائی 2006 کو انڈیا انٹرنیشنل سینٹر، نئی دہلی میں قومی اردو کونسل کے سالانہ جلسے کے انعقاد کے موقعے پر لی گئی ایک تصویر۔

قومی اردو کونسل کی جانب سے مہیلا دستکاری ودیالیہ، شمیم آباد، اِٹکی، رانچی (جھارکھنڈ) میں چلائے جارہے اردو اسٹڈی سینٹر میں اردو ڈپلوما کورس کے فارغین کے لیے 6 جولائی 2006 کو ایک جلسۂ تقسیم اسناد منعقد ہوا جس میں جھارکھنڈ کے گورنر عالی جناب سید سبط رضی نے اسناد تقسیم کیں۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں سند لیتی ہوئی طالبہ اجولا کماری۔

Date of Publication : 24/08/2006

URDU DUNIYA Monthly, September 2006, Vol. 8, Issue9
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کا معتبر علمی جریدہ

"فکر و تحقیق"

جو ہر سہ ماہی پر دعوت فکر دینے والے تحقیقی مواد کے ساتھ منظر عام پر آتا ہے

جس میں شائع ہونے والے مضامین کا خاصہ ہے معلوم حقائق کی چھان بین اور نا معلوم حقائق کی دریافت

صرف ایک جریدہ نہیں، ماضی کے اندوختوں اور حال کے

اکتسابات سے مستقبل کو مالا مال بنانے کی ایک تحریک

خود بھی اس رسالے کے خریدار بنیں اور دوسروں کو بھی اس کی خریداری کا مشورہ دیں۔

سالانہ قیمت بذریعہ ڈرافٹ، منی آرڈر یا چیک NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

دہلی سے باہر کے حضرات چیک نہ بھیجیں۔

غیر ملکی خریداروں کے لیے

	سادہ ڈاک	ہوائی ڈاک
پاکستان	192 روپے	480 روپے
نیپال	300 روپے	588 روپے
بنگلہ دیش	132 روپے	420 روپے
دیگر ممالک	300 روپے	684 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

ویسٹ بلاک: 8، ونگ: 7، آر. کے. پورم، نئی دہلی 110066

Printed and Published by Dr. R.K. Bhat, Principal Publication Officer, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. R.K. Bhat, Tel : 26103381, 26103938